الاصلاح

(ایک تعارف)

از

ضیاء الدین اصلاحی

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔ اعظم گڈھ

''الاصلاح''- ایک تعارف

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ کے ماہوار علمی و مذہبی رسالہ
کے مضامین و مشمولات کا تعارف اور اس کے شذرات کا جائزہ

از

ضیاء الدین اصلاحی

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر- اعظم گڈھ

نام کتاب: ''الاصلاح''-ایک تعارف

نام مصنف: ضیاء الدین اصلاحی

سال اشاعت ۱۴۲۷ھ
۲۰۰۷ء

صفحات: ۱۱۲

قیمت: ....

باہتمام

عبدالرحمان ناصر اصلاحی جامعی

ملنے کا پتہ

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح،
سرائے میر - اعظم گڈھ

فہرست مضامین ''الاصلاح''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمدالامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

۱۰۰ برس پہلے اعظم گڈھ ضلع کے مسلمانوں میں دینی روح اور صحیح مذہبی شعور کا فقدان تھا، ان میں باطل افکار وتصورات، مشرکانہ افکار وخیالات، غلط رسوم وعوائد رچ بس گئے تھے، تعلیم کا رواج بھی بہت کم تھا، اعظم گڈھ کے مغربی حصے میں کوئی دینی مدرسہ نہیں تھا، یہ صورت حال دیکھ کر اس نواح کے ایک صاحب دل بزرگ مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے دل میں مسلمانوں کی اصلاح کا داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے انجمن اصلاح المسلمین قائم کی، اس میں کچھ کامیابی ہوئی تو انہوں نے قصبہ سرائے میر کے شمال میں ایک افتادہ اور ویران زمین میں ایک اسلامی مدرسہ کی بنیاد ڈال دی جو اب مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ملک وبیرون ملک میں مشہور ہے۔

مولانا محمد شفیع صاحبؒ بانی مدرسۃ الاصلاح ایک بے نفس انسان تھے، انہوں نے علامہ شبلی مرحوم سے فرمائش کی کہ وہ مدرسہ کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیں لیکن علامہ شبلیؒ کا دائرۂ عمل بہت وسیع اور پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، انہوں نے اس نیک تحریک میں جس قدر ممکن ہوا خود بھی حصہ لیا اور اپنے ماموں زاد بھائی اور عزیز شاگرد مولانا حمید الدین فراہیؒ کو مدرسہ کا کام سنبھالنے کے لئے آمادہ کرنا شروع کیا۔

علامہ شبلیؒ کی وفات کے چند برس بعد مولانا حمید الدین فراہیؒ دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر فروکش ہوگئے، وہ تفسیر وقرآنیات

کے متبحر تھے، ان کی زندگی قرآن مجید میں غور وفکر کے لئے وقف تھی، اس بحر ناپیدا کنار میں شناوری اور غواصی سے ان پر جہاں کتاب الٰہی کے اسرار ورموز بے نقاب ہوئے وہاں ان پر یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی کہ مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور یہی ان کی صلاح و فلاح اور کامیابی وکامرانی کا ضامن بھی ہے۔

مولانا حمید الدین صاحبؒ نے جب مدرسۃ الاصلاح کو اپنے فکر وعمل کی جولان گاہ بنایا اور اپنے مخصوص نہج اور طرز کے مطابق اس کا نصاب وضع کیا تو اس میں قرآن مجید کو وہی جگہ دی جو اس کی ہونی چاہیے تھی، ان کے خیال میں اسی کو سارے علوم اسلامیہ کا محور ہونا چاہیے اور اسی کی روشنی میں تمام علوم کو پڑھنا پڑھانا چاہیے، اسی انداز پر انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن مجید کا درس دینا شروع کیا۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں جب مولانا فراہیؒ کا انتقال ہوا تو وہ اپنے تدبر فی القرآن کے نتائج اور قرآنی تحقیقات کا کثیر ذخیرہ چھوڑ گئے تھے، گو یہ زیادہ تر منتشر اور غیر مرتب حالت میں تھا بلکہ بعض تو نامکمل بھی تھا، تاہم یہ کسی بیش بہا خزانے سے کم نہ تھا، اس لئے مولانا کے علوم ومعارف کے شیدائیوں اور تلامذہ ومتوسلین کو اس کی طبع واشاعت کی فکر دامن گیر ہوئی، مولانا کی تصنیفی زبان عربی تھی جس کے جاننے والے ہندوستان میں کم تھے، اس لئے اسے اردو میں منتقل کرنے کا مسئلہ بھی سامنے آیا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحبؒ کو جو اس کام میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح مدد کے لئے تیار ہو گئے، ان کی پرزور تحریک سے مولانا فراہیؒ کے افکار وخیالات کو عام کرنے، ان کی تصانیف ومسودات اور ان کے ترجمے کی اشاعت کے لئے ۱۹۳۵ء میں دائرہ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا۔

دائرہ حمیدیہ کے مقاصد میں ایک ماہوار علمی ودینی رسالے کا اجرا بھی تھا، تاکہ وہ قرآن مجید سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کرے اور مسلمانوں کی مفید علمی ومذہبی خدمت انجام دے اور یہ مولانا فراہیؒ کے افکار وعلوم کی اشاعت میں ممد ومعاون بھی بنے، مولانا کے تلامذہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ یگانہ خصوصیات کے مالک تھے، ان کو قدرت نے یہ ملکہ بخشا تھا کہ وہ زبان وقلم دونوں سے مولانا کے خیالات ونظریات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکتے

تھے، اس لئے ان ہی کو دائرہ کی نگرانی ونظامت اور مولانا کی عربی تصنیفات کے ترجمہ کی خدمت اور "الاصلاح" کی ادارت کی ذمہ داری سپرد کی گئی، چنانچہ اس کا پہلا شمارہ ان کی ادارت میں جنوری ۱۹۳۶ء میں بڑی شان سے نکلا مگر نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد وہ بند ہو گیا ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

الاصلاح اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ تھا، "الندوہ" (مولانا شبلیؒ) کے علاوہ مدارس کی تاریخ میں اس پایہ ومعیار کا کوئی رسالہ نہیں نکلا، بہت قلیل مدت میں بھی وہ اپنے لازوال نقوش چھوڑ گیا، اس نے کتاب الٰہی، دین خداوندی اور علم ودین کی خدمت اور مسلمانوں کی رہنمائی کا بے نظیر کام انجام دیا مگر حیرت ہوتی ہے کہ معمولی معمولی رسالوں کا جو سال بھر تک بھی نہیں شائع ہوئے ڈنکا پیٹا جا رہا ہے اور اردو کے ادبی رسائل وجرائد میں ان پر طویل مضامین نکل رہے ہیں لیکن بہت سے بیش قیمت رسالوں کو جنہوں نے علم ومذہب اور زبان وادب کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں بھلا دیا گیا ہے اور اب لوگوں کو ان کے نام بھی نہیں معلوم ہیں، "الاصلاح" بھی ان ہی فراموش شدہ رسالوں میں ہے۔

۱۹۹۹ء میں جب مدرسۃ الاصلاح میں مولانا امین احسن صاحبؒ پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا تو راقم نے اس کے لئے "الاصلاح" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، تاکہ اس بھولے بسرے رسالے کی یاد تازہ ہو جائے بعد میں یہ مضمون ششماہی "علوم القرآن" علی گڑھ کے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نمبر میں شائع ہوا، اس کے بعد میرے مخدوم ومحترم بزرگ مولانا عبد الرحمان ناصر اصلاحی جامعی نے مجھے اکسایا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کردوں، مصارف کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں لیکن مجھے تامل اس لئے تھا کہ یہ مضمون سیمینار کے لئے رواروی میں لکھا گیا تھا اور بہت کچھ نامکمل بھی تھا، میں عرصے تک یہی عذر کرکے ٹالتا رہا کہ فرصت ملنے پر جب یہ مکمل کرلوں گا تو شائع ہو جائے گا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے، بالآخر ان کا اصرار غالب آیا اور کسی قدر اضافہ وترمیم کے بعد اب یہ اوراق مدرسۃ الاصلاح، الاصلاح، دائرہ حمیدیہ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

مولانا عبدالرحمان ناصر اصلاحی مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے عزیز اور محبوب ترین شاگرد ہیں، انہیں ان کی صحبت و خدمت میں رہنے اور سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے، وہ خود بھی صاحب قلم اور ''الاصلاح'' کے مضمون نگاروں میں ہیں، ان کا مدرسۃ الاصلاح، الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ تینوں سے شروع ہی سے گہرا تعلق رہا ہے اور الحمدللہ اب بھی ہے اور غالبًا اب وہی تنہا ''الاصلاح'' کے مضمون نگار باقی رہ گئے ہیں، اللہ ان سب اداروں کی سرپرستی کے لئے مدت دراز تک باقی رکھے، آمین! ان کا بار بار حوصلہ افزا اصرار و تقاضا نہ ہوتا تو میرے اور کاموں کی طرح یہ کام بھی ادھورا رہ جاتا، انہوں نے اس کے لئے صرف اصرار ہی نہیں کیا بلکہ ہر ہر قدم پر میری رہنمائی بھی فرمائی، ''الاصلاح'' کی جلدیں اب ناپید ہوگئی ہیں انہوں نے اپنے وجود سے زیادہ ان کو قیمتی سمجھ کر محفوظ کر رکھا ہے مگر جب بھی مجھے ان کی ضرورت ہوئی بے تکلف میرے حوالے کر دیا، میں ان کا بہت ممنون ہوں کہ ان کے تعاون و اصرار سے ایک بہت مفید کام انجام پا گیا، قارئین اپنی دعاؤں میں ان کے ساتھ مجھے بھی یاد رکھیں، مدرسۃ الاصلاح کے استاذ مولوی نسیم ظہیر اصلاحی صاحب نے بھی حوالوں کی تلاش میں میری مدد فرمائی ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس مختصر کتاب سے الاصلاح کی تاریخ اور اس کے سرپرستوں، معاونوں اور مضمون نگاروں کے نام محفوظ ہو جائیں گے لیکن انسان کا کوئی کام مکمل اور بھول چوک سے خالی نہیں ہوتا، اس تحریر میں بھی بہت سی فروگزاشتیں ہوں گی، اہل علم ان سے آگاہ فرمادیں، تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح ہو جائے۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۱۳ر ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ / ۴ر جنوری ۲۰۰۷ء

الاصلاح

پس منظر: صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے کل سرسبد تھے، ان کی علمی و عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تعلیم سے فراغت کے بعد وہ سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور اور ہفتہ وار ''سچ'' لکھنؤ کی ادارت سے منسلک رہے مگر جلد ہی ان مشاغل کو چھوڑ کر مولانا حمید الدین فراہیؒ کی خدمت میں ان سے قرآن مجید کا درس لینے کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر تشریف لائے۔

ان کو یہاں سے بھی ایک علمی رسالہ نکالنے کا خیال دامن گیر ہوا مگر گوناگوں موانع کی وجہ سے عملی اقدام کی جرأت نہ کر سکے اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی وفات کے بعد ان کے اور مولانا کے دوسرے تلامذہ و متوسلین کے سامنے سب سے بڑا اور اہم مسئلہ مولانا فراہیؒ کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی طبع و اشاعت کا تھا، مولانا اصلاحیؒ اور ان کے رفقاء اپنا سارا وقت اور تمام قوت و محنت اسی خدمت کے لیے مخصوص کرنا چاہتے تھے اور فی الواقع یہ اتنا وسیع اور عظیم الشان کام تھا کہ اس کی موجودگی میں کسی اخبار یا رسالہ نکالنے کے لیے ان حضرات کے پاس نہ فرصت تھی نہ سرمایہ۔

کئی سال اسی حیص بیص میں گزر گئے اور مولانا امین احسن صاحبؒ کو مدرسہ کی ضرورت سے ملایا و سماترا کے لیے رخت سفر باندھنا پڑا، یہیں ان کو اس زمانے کے ناظم مدرسۃ الاصلاح اور مولانا فراہیؒ کے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشید الدین صاحبؒ کے گرامی نامہ سے یہ بشارت ملی کہ جناب حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب سول سرجن بارہ بنکی اور مولوی حفیظ احمد خاں صاحب (۱) منصف حیدرآباد نے مولانا کی تصنیفات کی اشاعت کے لیے نہایت حوصلہ افزا مدد کی ہے۔

ملایا سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی واپسی کے بعد انہیں ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحبؒ کا یہ دعوت نامہ ملا کہ چند ماہ کے لیے مدرسہ کے مشاغل سے کلیتاً علاحدہ ہو کر وہ ان کے پاس رہیں اور اپنا سارا وقت مولانا فراہیؒ کے مسودات کی ترتیب و تصحیح اور ترجمہ پر صرف کریں، تا کہ ان کی طبع و اشاعت کے کام میں مزید تاخیر نہ ہو۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا قیام بارہ بنکی میں تھا، چنانچہ وہاں مولانا امین احسن صاحبؒ بھی تشریف لے گئے اور اپنا تمام وقت مسودات کی ترتیب میں صرف کرتے اور شام کی صحبتوں میں ڈاکٹر صاحب سے مولانا کی تصنیفات، مدرسہ کے حالات اور قومی و مذہبی ضروریات پر گفتگو فرماتے، ڈاکٹر صاحب مدرسہ کی خدمت اور قوم کی مذہبی و معاشرتی اصلاح کے لیے ایک رسالہ یا اخبار کی ضرورت عرصہ سے محسوس کر رہے تھے، ان کے سامنے جب مولانا کی تصنیفات کی نوعیت پوری طرح آئی اور ان کے علوم و معارف کی عام اشاعت کا احساس پیدا ہوا تو انہوں نے ایک مطبع کے قیام اور کم از کم ایک ماہوار رسالہ کے اجرا کی ضرورت پر زور دیا۔

مولانا امین احسن صاحبؒ کو اس راہ کی مشکلات کا اندازہ تھا، اس لیے شروع میں اس ضرورت سے اتفاق کے باوجود انہوں نے اس سے گریز کرنا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب کے پیہم اصرار اور گوناگوں دلائل کی وجہ سے خدا نے ان کے دل کو بھی اس ضرورت کے لیے کھول دیا، اس طرح ڈاکٹر صاحب کی تجویز سے طے پایا کہ ایک مطبع قائم ہو، مولانا کی عربی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے شائع ہوں، ایک ماہوار رسالہ نکلے، ان کاموں کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے سابق عطیہ میں مزید اضافہ فرمایا اور ان کی ہدایت پر اس نئی صورت حال سے جب مولوی حفیظ احمد خان صاحب کو مطلع کیا گیا تو یہ ان کے بھی دل کی آواز تھی، انہوں نے اس کی مکمل تائید کی اور ہر قسم کے مالی تعاون کا وعدہ فرمایا۔

مولاناؒ کے اعزہ میں ان کے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشید الدین صاحب ناظم مدرسہ، صاحب زادگان جناب شیخ محمد سجاد و شیخ محمد عباد، اعزہ محمد فاروق نعمانی (۲)، حاجی حامد نعمانی (۳)، نیز شیخ محمد سلیمان (۴) مولوی عبد الغنی انصاری (۵)، مولوی حمید انصاری (۶) وغیرہ نے ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔

مذکورہ بالا حضرات پر مشتمل اس وقت ایک مجلس کی تشکیل عمل میں آئی تھی جس کا نام حضرت مولانا فراہیؒ سے شرف انتساب کے لیے دائرۂ حمیدیہ رکھا گیا تھا، یہی مجلس اس سلسلہ کے تمام کاموں کی نگراں اور ذمہ دار تھی، اس کے صدر حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب و نائب صدر جناب مولوی عبد الغنی انصاری مقرر ہوئے تھے۔

اس وقت دائرۂ حمیدیہ کے پیش نظر جو مقاصد تھے، ان میں ایک ماہوار رسالہ کا اجرا بھی تھا جس کا نام مدرسہ کے تعلق سے ''الاصلاح'' تجویز ہوا، اس کی ادارت، دائرہ کے کاموں کی عام نگرانی اور مولانا کی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے ذمہ کی گئی تھی۔ (۷)

الاصلاح کا اجرا اور اس کے مقاصد: الاصلاح کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۳۶ء میں دائرۂ حمیدیہ کی جانب سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ادارت میں نکلا، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کرے اور مسلمانوں کی مفید علمی و مذہبی خدمت انجام دے۔ (۸)

رسالہ کے مضامین و مشمولات ان ہی مقاصد کے تحت ہوتے تھے، اس لیے ان میں تفریح اور عام لوگوں کی دل چسپی کا سامان نہیں ہوتا تھا جو لوگ محض تفریح اور دل چسپی کی چیزیں پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کے لیے الاصلاح میں زیادہ کشش و لذت نہیں ہو سکتی تھی، مولانا امین احسن اصلاحیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''عام تفریح اور دل چسپی کے رسالے اور اخبارات ملک میں ہزاروں نکل رہے ہیں، کیا ضرورت ہے کہ ایک ہی کام ہر شخص کرے، آخر ہم کو کچھ ایسی چیزیں بھی تو پڑھنی چاہیے جو فسی مذاق سے ہٹ کر سنجیدہ فکر و نظر کی دعوت دیں''۔ (۹)

آگے فرماتے ہیں:

> ''ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہم بازار میں وہ جنس لے کر نہیں آئے ہیں جس کی گاہکوں کو طلب ہے لیکن ہم نے ایسا قصداً کیا ہے، اگر ہم نے مذہب کی خدمت کا نام لیا ہے تو اس کی راہ تجارت سے بالکل علاحدہ ہونی چاہیے:

ہرچہ در خود کردن است ممکن — نہ تواں کرد خواہ نتواں کرد
کار از بہر کار باید کرد — از پئے واہ واہ نتواں کرد
کز پئے واہ واہ ناداناں — زندگانی تباہ نتواں کرد (ملا)

اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ رسالہ میں صرف خشک اور بے کیف مضامین ہی شائع ہوتے تھے بلکہ اس کے مضامین میں تنوع ہوتا تھا، تاکہ اس کی افادی حیثیت قائم رہے اور ہر مذاق وطبیعت کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، عام علمی وادبی مضامین بھی بالکل خشک اور بے روح نہیں ہوتے تھے، سہل اور آسان قسم کے مضامین بھی دیے جاتے تھے، تاکہ عام لوگوں کی تعلیم وہدایت کا ذریعہ بنیں، بعض دل چسپ اور معلومات افزا چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں، تاہم شکر اتنی نہیں ہوتی تھی کہ کنین کا اثر ہی زائل ہو جائے، الاصلاح کا پہلا شمارہ نکلا تو اس کے بعض ہمدردوں اور خریداروں نے اس کے مطالب ومحتویات کے مشکل ہونے کی شکایت کی، اس کا جواب دیتے ہوئے اس کے فاضل مدیر نے بتایا کہ:

"اس کے بعض ابواب صرف اہل علم ہی کے لیے مخصوص ہیں، ان سے عام لوگ بہ آسانی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، تاہم اس کا کچھ حصہ عام لوگوں کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے، اس میں اسلوب نگارش وطرز تحریر یا علمی اصطلاحات کی وجہ سے اشکال نہیں ہوتا بلکہ خود مطالب ومقاصد کی بلندی عام ذہنی پستی اور عقلی نارسائی کی وجہ سے بلند تر ہوگئی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اپنے فکر وتامل کی استعداد کی تربیت کریں اور دماغ کو سنجیدہ مباحث کے لائق بنائیں، سنجیدہ مباحث کے مطالعہ کی عادت ڈالیں، یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ اسلام کے متعلق عام مسلمانوں کی واقفیت بعض فضول قصوں اور چند فروعی مسائل سے زیادہ نہیں، تاہم الاصلاح کو آسان کرنے کے خیال سے غفلت نہیں کی جائے گی اور اس کے بعض صفحات صرف عام تعلیم واصلاح کے لیے مخصوص رہیں گے"۔(۱۱)

رسالہ میں زیادہ تر مضامین قرآن مجید سے متعلق شائع ہوتے تھے جن کا انداز بحث ونظر

غالب عالمانہ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے عام پڑھنے والوں کی طبیعت پر جو خشک علمی مباحث کے پڑھنے کے عادی نہیں بڑا بوجھ پڑ رہا تھا، اس لیے اگلے سال ہر اشاعت میں ایسے مضامین شائع کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا جن کا تعلق عام مسلمانوں کی زندگی سے ہے کیوں کہ رسالہ کے بنیادی مقاصد میں خدمت قرآنی کے علاوہ تذکیر واصلاح بھی شامل تھی لیکن ابھی تک اصلاحی مضامین بالالتزام نہیں شائع ہوتے تھے، آیندہ اس سلسلہ کو التزاماً قائم رکھنے کی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"انشاء اللہ یہ مضامین ہر استعداد کے لوگوں کے لیے دل چسپ ہوں گے، اسی طرح عام دل چسپی کے لیے تاریخی مضامین شائع کرنے کا ارادہ ہے اور تلخیصات کے باب میں انتخابات دل چسپ اور آسان ہوں گے"۔(۱۲)

الاصلاح کی اشاعت کے ایک سال گزرنے پر بہت سے دوستوں اور بزرگوں کے خطوط موصول ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں مشورہ دیا گیا تھا کہ نئے سال سے رسالہ میں عام دل چسپی کے بعض ابواب کا اضافہ کر دیا جائے ورنہ اس کا قائم رہنا مشکل ہوگا، ان مخلصین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے حکم کی مکمل تعمیل سے معذوری ظاہر کی اور صرف اس کو ممکن بتایا ہے کہ مخصوص قسم کے مضامین جو بیشتر طلبہ کے لیے لکھے جاتے ہیں، کم کر دیے جائیں اور ایسے مضامین زیادہ ہوں جن میں قرآن کی عام تعلیمات سادہ لفظوں میں پیش کی جائیں، اس زمانہ میں عام دل چسپی کی جو چیزیں ضروری ہیں وہ الاصلاح میں جگہ نہیں پا سکتیں، اگر اس چیز کی وجہ سے الاصلاح کا قائم رہنا ناممکن ہوا تو مجبوری ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس کام کو جاری رکھنا چاہے گا تو غیب سے اس کا سامان فرمائے گا اور اگر اس نے نہ چاہا تو بغیر کسی ندامت وافسوس کے رسالہ کو بند کر دیا جائے گا مگر تجارت کے لیے اس کے بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی، مدیر الاصلاح کے نزدیک الاصلاح کا اصلی اور بنیادی مقصد قرآن مجید کی خدمت تھا اس لیے اسی کے لیے اس کو باقی رکھا جا سکتا تھا، وہ مسلمانوں کے اندر دو قسم کے لوگوں کی نشان دہی کرتے ہیں، ایک وہ جو قرآن کو پڑھتے ہی نہیں، دوسرے وہ جو پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں، الاصلاح چاہتا تھا کہ جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتے وہ پڑھنے لگیں اور جو پڑھتے ہیں لیکن

سمجھتے نہیں وہ غور کریں۔ (۱۳)

الاصلاح کے صفحات پر اس کے ان مقاصد کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"عام طور پر لوگ الاصلاح کی علمیت اور مذہبیت سے شاکی ہیں اور ناولوں اور افسانوں کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں اور چوں کہ یہ چیزیں اس میں نہیں پاتے، اس لیے اس میں اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتے، اگر عام خواہش کی پیروی کی جائے تو ممکن ہے اس کا حلقہ اشاعت کچھ وسیع ہو جائے لیکن یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی، ہم اس کے نتائج سے بے خبر نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ ہے"۔ (۱۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الاصلاح قرآن مجید کی خدمت، مسلمانوں کی رشد و اصلاح اور ان کی ذہنی و دماغی تربیت کے لیے نکالا گیا تھا، وہ انہیں مفید علمی و دینی لٹریچر کے مطالعہ اور سنجیدہ اور باوقار تحریروں کے پڑھنے کا عادی بنانا چاہتا تھا اور ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا تھا جو قرآن مجید میں غور و فکر اور اس سے رہنمائی حاصل کرے، اسی لیے فقیہانہ موشگافیوں اور مناظرانہ بحث و جدال سے اس نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا، اس کے کئی شماروں میں مصدقا لما بین یدیہ کی تاویل و توجیہ کے بارے میں مولانا بدرالدین اصلاحیؒ اور مولانا سید محمد طہٰ اشرف احسنویؒ کے درمیان جو علمی بحث و مذاکرہ جاری رہا، اس میں دونوں کو ایک دوسرے کے متین سنجیدہ اور شائستہ انداز بحث اور طالب علمانہ تحقیق و جستجو کا اعتراف رہا، اس سلسلہ کی آخری قسط میں خود مدیر الاصلاح رقم طراز ہیں:

"ہم دونوں صاحبوں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اس مذاکرہ قرآنی کی علمی و مذہبی شان کو نہایت ضبط و احتیاط کے ساتھ باقی رکھنے کی کوشش کی گئی اور قلم کہیں بھی بحث کے متعین حدود سے متجاوز ہو کر دلوں کو زخمی کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوا، ہماری دلی خواہش ہے کہ اس طرح کے مفید مباحث پر ان صفحات میں بحث و نظر ہو اور لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں دوستوں کو

فہم قرآن کا ذوق عطا فرمائے اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کے لیے تدبر قرآن کی راہیں باز ہوں"۔ (۱۵)

الاصلاح کا سائز، صفحات اور ٹائٹل: الاصلاح متوسط تقطیع کے چونسٹھ (۶۴) صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، ٹائٹل کے چار صفحے ان کے علاوہ ہوتے تھے، پہلے صفحہ کے مندرجات اس طرح ہوتے تھے:

پہلی سطر: الاصلاح (جلی حرفوں میں)

دوسری سطر: دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ (قدرے جلی)

تیسری سطر: مرتبہ (قدرے جلی)

چوتھی سطر: امین احسن اصلاحی (جلی)

پانچویں سطر: باہتمام عبدالاحد اصلاحی (خفی)

چھٹی سطر: دفتر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ (جلی)

ساتویں سطر: قیمت سالانہ للعہ/ (بیرون ہند کے لیے ے/) فی پرچہ چھ آنے (خفی)

۱۹۳۷ء سے ٹائٹل کے پہلے صفحہ پر صرف اوپر ہی کی چار سطریں ہوتی تھیں، آخر کی تینوں سطروں کا ذکر ٹائٹل کے چوتھے صفحے پر ہدایات و قواعد کے ضمن میں ہوتا تھا، اسی صفحہ پر پہلی سطر میں رجسٹرڈ نمبر درج ہوتا تھا پھر دائرہ حمیدیہ کی اعانت کی تین صورتیں تحریر ہوتی تھیں اور آخر میں ہدایات و قواعد کے زیر عنوان خریداروں کے لیے چندے کے ضوابط قلم بند ہوتے تھے، اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ انگریزی مہینہ کی ۱۵ ر تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔

ٹائٹل کے دوسرے اور تیسرے صفحوں پر مولانا فراہیؒ کی تصنیفات کے اشتہار ہوتے تھے، جس کے لیے دوسرے صفحہ کے شروع میں یہ عنوان ہوتا تھا:

"تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ" بعد میں یہ عنوان تبدیل ہو کر "دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات" ہو گیا تھا۔

الاصلاح کے ابواب: الاصلاح کے مضامین مختلف ابواب اور کالم کے تحت شائع ہوتے تھے:

۱- شذرات: یعنی افتتاحیہ جو ایڈیٹر کے قلم سے ہوتا تھا، یہ شروع میں کبھی تین چار

معمولاً سات صفحوں کا ہوتا تھا، اس میں مدرسہ و دائرہ کے حالات، قومی، ملی، تعلیمی اور بین الاقوامی امور و مسائل زیر بحث آتے تھے، اس کی اہمیت کے پیش نظر آخر میں اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

۲-باب التفسیر: مولانا حمیدالدین فراہیؒ نظام القرآن کے نام سے جو تفسیر لکھ رہے تھے وہ نامکمل تھی اور صرف چند متفرق سورتوں ہی کی تفسیر لکھ سکے تھے، یہ اجزائے تفسیر عربی میں تھے، باب التفسیر میں ان کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا تھا جو مولانا کے شاگرد رشید مدیر الاصلاح مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے قلم سے ہوتا تھا اور اتنا رواں اور شگفتہ ہوتا تھا کہ ترجمے پر اصل کا دھوکا ہوتا تھا، یہ باب صرف ایک سال جنوری تا دسمبر ۱۹۳۶ء میں شامل رہا، جنوری ۱۹۳۷ء سے اسے ختم کر دیا گیا اور مولانا کی تفسیر کا اردو ترجمہ معارف قرآن کے باب میں چھپنے لگا تھا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۳-معارف قرآن: یہ باب قرآن مجید سے متعلق اہم اور بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا، اس میں دو یا تین مضامین ہوتے تھے، اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے جنوری ۳۶ء میں اس کے تحت شائع ہونے والے مضامین کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

۱-ترتیب و نظام قرآن: استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہیؒ۔

۲-قرآن کا علمی پایہ: مولانا حافظ اسلم جیراج پوریؒ۔

۳-تمسک بالکتاب: چودھری غلام احمد پرویز۔

اسی باب میں علوم قرآن سے متعلق مولانا فراہیؒ کی بعض عربی تصنیفات اقسام القرآن اور ذبیح کون ہے وغیرہ کے اردو ترجمے شائع ہوئے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ جنوری ۳۷ء سے باب التفسیر ختم کر کے اسی باب میں ضم کر دیا گیا تھا۔

۴-مقالات: اس عنوان کے تحت علمی و ادبی نوعیت کے مضامین شائع کیے جاتے تھے، اس حصہ میں اکثر ایک ہی مضمون ہوتا تھا، انتخاب میں اس کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ مضمون خشک اور بے روح نہ ہو۔

۵-مذاکرہ: اس میں قرآنی آیات کی تاویل و توجیہ سے متعلق مدلل مضامین شائع

کیے جاتے تھے اور ان کے متعلق آنے والے خطوط و استفسارات کے جواب دیے جاتے تھے، اس میں ایک یا دو مضمون ہوتے تھے۔

۶-موعظہ حسنہ: اس باب میں عام مسلمانوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے آسان اور سہل زبان میں مفید مذہبی و اخلاقی مضامین شائع کیے جاتے تھے، اس کے تحت ایک اور کبھی دو مضمون شائع ہوتے تھے

۷-ادبیات: اس میں کسی مشہور شاعر کی غزل یا نظم شائع کی جاتی تھی۔

۸-تلخیصات: یہ باب یورپ اور مصر وغیرہ کے رسائل کے دل چسپ، مفید اور معلومات افزا مضامین کی تلخیص و اقتباس پر مشتمل ہوتا تھا۔

۹-تقریظ و تبصرہ: اس عنوان کے تحت نئی کتابوں پر ریویو کیا جاتا تھا۔

الاصلاح کے یہ مستقل ابواب تھے، باب التفسیر ایک سال بعد ختم اور معارف قرآن کے باب میں ضم کر دیا گیا مگر باقی ابواب مسلسل قائم رہے لیکن تمام ابواب ہر ہر شمارہ میں بالالتزام نہیں ہوتے تھے، کسی شمارے میں مقالات کا باب نہیں ہوتا تھا، کبھی مذاکرہ کا باب موجود نہیں تھا اور کوئی اشاعت موعظہ حسنہ سے خالی ہوتی تھی، تلخیصات، ادبیات اور تقریظ و تبصرہ کے کالم بھی ہر ہر شمارہ میں التزاماً نہیں رہتے تھے، البتہ شذرات اور معارف قرآن سے کوئی شمارہ خالی نہیں ہوتا تھا۔

دسمبر ۳۷ء سے ایک باب حکمت غرب کا اضافہ کیا گیا جو الاصلاح کی آخری اشاعت تک برابر رہا لیکن درمیان کے حسب ذیل شماروں میں یہ باب بھی موجود نہیں ہے، اگست و اکتوبر ۱۹۳۸ء، اور فروری نیز اگست و اکتوبر ۱۹۳۹ء میں۔ اس عنوان کے تحت مولوی نیاز احمد صدیقی کا ایک ہی مضمون ''مارکس آریلیس (Marcus Aurelius) کے خیالات''، مسلسل شائع ہوتا رہا، اکتوبر ۱۹۳۹ء کے شمارہ کی تلخیصات ''افکار جدیدہ'' کے عنوان سے درج ہیں۔

الاصلاح کے مضمون نگار اور مضامین: الاصلاح کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ نہایت بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کے مضمون نگاروں میں بہت سے معروف اہل علم و قلم شامل تھے اور بعض حضرات نے بعد میں اردو کے بہت ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے شہرت پائی، یہاں

حروف تہجی کے مطابق ان سب حضرات کے اسمائے گرامی اور ان کے مضامین کی فہرست قلم بندکی جاتی ہے، اس کی بھی تصریح کردی گئی ہے کہ یہ مضامین کب اور کن ابواب کے تحت چھپے ہیں:

۱-جناب خواجہ ابوالحسن صاحب (۱۶) محکمہ تعلیمات حکومت ہند، شملہ

مذاکرہ: (۱) نجات اگست ۱۹۳۷ء

۲-مولانا ابوالخیر محمد خیر اللہ قادری (۱۷)

موعظہ حسنہ: (۱) نماز خیر دارین ہے اکتوبر ۱۹۳۶ء

۳-مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی (۱۸) متوفی ۱۹۹۰ء

معارف قرآن: (۱) قرآن اور ترتیب اسمائے انبیائے کرام فروری ۱۹۳۶ء (۲) قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصۂ آدمؑ وشیطان (تین قسطوں میں) مارچ تا مئی ۱۹۳۶ء (۳) قرآن مجید اور حج جون ۱۹۳۶ء

مذاکرہ: (۱) سورہ ہود کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب مارچ ۱۹۳۶ء

موعظہ حسنہ: (۱) فرصت کی گھڑیاں جنوری ۱۹۳۸ء (۲) ہماری سب سے اہم ضرورت مارچ واپریل ۱۹۳۹ء

مقالات: (۱) جنگ نومبر ۱۹۳۹ء

تلخیصات: (۱) ولایت متحدہ امریکہ اور علوم مشرقیہ جنوری ۱۹۳۶ء (۲) علمائے یورپ کا معیار بحث ونظر مارچ ۱۹۳۶ء، (۳) انگریزی شہنشاہیت کے استحکام کا راز اپریل ۱۹۳۶ء، (۴) علم امتحان کی کسوٹی پر مئی ۱۹۳۶ء (۵) لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں مئی ۱۹۳۶ء

تقریظ وتبصرہ: (۱) مئی ۱۹۳۶ء

۴-ڈاکٹر احمد غلوش (۱۹)

مقالات: (۱) تصوف اسلام (تین قسطوں میں) اگست تا اکتوبر ۱۹۳۸ء

۵-مولانا اختر احسن اصلاحی (۲۰) متوفی ۱۹۵۸ء

معارف قرآن: (۱) استاذ امام کے ترجمہ قرآن کا نمونہ اپریل ۱۹۳۶ء (۲) سورۂ حج کی ایک آیت کی صحیح تاویل ستمبر ۱۹۳۶ء

مذاکرہ: (۱) حافظوا علی الصلوات الآیۃ کا تعلق ماقبل ومابعد سے ستمبر ۱۹۳۶ء (۲) استدراک (دو قسطیں) مئی وجون ۱۹۳۷ء، (۳) استدراک بر "نظر" ستمبر ۱۹۳۷ء

۶-مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری (۲۰) متوفی ۱۹۵۵ء

معارف قرآن: (۱) قرآن کا علمی پایہ جنوری ۱۹۳۶ء

مقالات: (۱) حلیمہ نجدیہ مئی ۱۹۳۶ء (۲) صباح جون ۱۹۳۶ء

۷-مولانا اشرف علی تھانوی (۲۱) متوفی ۱۹۴۳ء

تلخیصات: (۱) تکفیر کے متعلق اللہ والوں کا طریقہ (۲۲) جولائی ۱۹۳۶ء

۸-مولانا اقبال احمد خاں سہیل (۲۳) متوفی ۱۹۵۵ء

مقالات: (۱) دیباچہ سیرت شبلی اکتوبر ۱۹۳۶ء، (۲) سیرت شبلی (پندرہ قسطیں مع دیباچہ) نومبر، دسمبر ۱۹۳۶ و جنوری ۱۹۳۷ء، و مارچ تا نومبر ۱۹۳۸ء، اور جنوری وفروری ۱۹۳۹ء

۹-مولانا امین احسن اصلاحی (۲۴) متوفی ۱۹۹۷ء

معارف قرآن: (۱) تیسیر قرآن (نو قسطوں میں) اپریل تا دسمبر ۱۹۳۶ء (۲) نظم قرآن جولائی ۱۹۳۶ء (۳) تدبر قرآن (چار قسطیں) جولائی تا اکتوبر ۱۹۳۷ء (۴) قربانی نومبر ۱۹۳۷ء

مذاکرہ: (۱) اسمائے سور جون ۱۹۳۶ء (۲) ترجمان القرآن (آزاد) ربائبکم اللاتی الخ ...... وما انزل علی الملکین الخ ...... لاطلاق ولا عتاق (تین قسطیں) جنوری تا مارچ ۱۹۳۷ء (۳) تحقیق قربانی اور تفسیر بیان للناس فروری ۱۹۳۸ء (۴) استدراک (مولانا سید طہٰ اشرف استھوی کے مضمون "بلاغ الحق" پر) اکتوبر ۱۹۳۸ء (۵) ہمارے علماء کے فقہی اختلافات (چار قسطیں) جولائی تا اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۶) سورۂ تحریم وذبح کے متعلق شکوک ستمبر ۱۹۳۹ء (۷) واجعلنا للمتقین اماما کی تاویل نومبر ۱۹۳۹ء

موعظہ حسنہ: (۱) نماز (پانچ قسطیں) جنوری تا مئی ۱۹۳۶ء

تلخیصات: (۱) ڈاکٹر کارل کی بہشت فروری ۱۹۳۶ء، (۲) عالم خواب فروری ۱۹۳۶ء (۳) فتنۂ تکفیر اگست ۱۹۳۶ء، (۴) آزاد ملکوں کی آزاد تعلیم دسمبر ۱۹۳۶ء، (۵) آناں کہ غنی

ترانہ محتاج ترانہ دسمبر ۱۹۳۶ء، (۶) افریقہ کے صحراؤں میں ایک نئی دنیا کی تعمیر دسمبر ۱۹۳۶ء، (۷) جاپانیوں میں قربانی کا جذبہ مارچ ۱۹۳۷ء، (۸) ہٹلر کی سیاسی انجیل مارچ ۱۹۳۷ء، (۹) رحمت یا لعنت نومبر ۱۹۳۷ء، (۱۰) قوت ارادی کی تربیت دسمبر ۱۹۳۷ء، (۱۱) آنکھوں سے سننے والے جنوری ۱۹۳۸ء، (۱۲) قرآن کی قولی اور عملی تفسیر (اقتباس از معارف) فروری ۱۹۳۸ء، (۱۳) شرق عربی کی بیداری جون ۱۹۳۹ء، (۱۴) لیڈر جون ۱۹۳۹ء

تقریظ وتبصرہ: (۱) دی لاسٹ پرافٹ (ایف کے درانی) مارچ ۱۹۳۷ء، (۲) معیار العلما (اکبر خاں نجیب آبادی) مارچ ۱۹۳۷ء، (۳) تحقیق قربانی (رسالہ بلاغ) مارچ ۱۹۳۷ء، (۴) بیان للناس (مولانا احمد الدین) اگست ۱۹۳۷ء، (۵) فصل الخطاب (اکبر خاں نجیب آبادی) اگست ۱۹۳۷ء، (۶) فکر ونشاط (جوش ملیح آبادی) اکتوبر ۱۹۳۷ء، (۷) مسلمان اور سیاسی کشمکش (مولانا مودودی-تین قسطیں) جنوری تا مارچ واپریل (مشترکہ شمارہ) ۱۹۳۹ء

۱۰-مولانا بدر الدین اصلاحی (۲۵) متوفی ۱۹۹۶ء

معارف قرآن: (۱) مصدقاً لما بین یدیہ کی صحیح تاویل نومبر ۱۹۳۶ء

مذاکرہ: (۱) مصدقاً لما بین یدیہ (دو قسطیں-مولوی سید محمد طٰہٰ اشرف استھوی کی تنقید کے جواب میں) جون وجولائی ۱۹۳۷ء، (۲) حروف مقطعات اکتوبر ۱۹۳۷ء، (۳) لفظ آلاء کی تحقیق نومبر ۱۹۳۷ء، (۴) واخر متشابہات دسمبر ۱۹۳۷ء

موعظہ حسنہ: (۱) پاداش عمل ستمبر ۱۹۳۶ء

مقالات: (۱) علامہ شبلی نعمانی پر فتوائے تکفیر اگست ۱۹۳۶ء

تلخیصات: (۱) تربیت جون ۱۹۳۶ء

۱۱-استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ (۲۶) (متوفی ۱۹۳۰ء)

الاصلاح کے پہلے شمارہ سے آخری شمارہ تک مولانا فراہیؒ کے جن رسائل تفسیر اور کتب قرآنیہ کے اردو ترجمے مولانا امین احسن صاحبؒ کے قلم سے باب التفسیر اور معارف قرآن کے زیر عنوان پابندی سے شائع ہوتے رہے ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱- تفسیر سورۂ فیل (سات قسطیں) جنوری تا جولائی ۱۹۳۶ء

۲- تفسیر سورۂ کافرون (تین قسطیں) اگست تا اکتوبر ۱۹۳۶ء

۳- تفسیر سورۃ العصر (دو قسطیں) نومبر ودسمبر ۱۹۳۶ء

۴- تفسیر سورۃ التین (چار قسطیں) جنوری تا اپریل ۱۹۳۷ء

۵- تفسیر سورۃ الشمس (چار قسطیں) مئی تا اگست ۱۹۳۷ء

۶- تفسیر سورۂ عبس (چار قسطیں) ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۷ء

۷- تفسیر سورۃ المرسلات (چار قسطیں) جنوری تا اپریل ۱۹۳۸ء

۸- تفسیر سورۂ قیامہ (چھ قسطیں) مئی تا اکتوبر ۱۹۳۸ء

۹- تفسیر سورۂ تحریم (پانچ قسطیں) نومبر ۱۹۳۸ء تا مئی ۱۹۳۹ء، (۲۷)

۱۰- تفسیر سورۃ الذاریات (چھ قسطیں) جون تا نومبر ۱۹۳۹ء

۱۱- ذبیح کون ہے؟ (۱۵ قسطیں) جنوری ۱۹۳۸ء تا مارچ اپریل (مشترکہ شمارہ) ۱۹۳۹ء

۱۲- اقسام القرآن (۷ قسطیں) مئی تا نومبر ۱۹۳۹ء، (۲۸)

ان کے علاوہ حسب ذیل اردو تحریریں بہ تفصیل ذیل شائع ہوئیں:

معارف قرآن: (۱) ترتیب ونظام قرآن جنوری ۱۹۳۶ء (۲) خیالات اثنائے ترجمۂ قرآن فروری ۱۹۳۶ء

مذاکرہ: (۱) علامہ فراہی کا ایک تعلیمی خط فروری ۱۹۳۶ء

موعظہ حسنہ: (۱) اصلاح اور نماز جون ۱۹۳۶ء

۱۲-مولانا داؤد اکبر اصلاحی (۲۹) (متوفی ۱۹۸۳ء)

معارف قرآن: (۱) صراط مستقیم کی حقیقت نومبر ۱۹۳۸ء (۲) والنجم اذا ھوٰی فروری ۱۹۳۹ء (۳) والعادیات ضبحا مارچ، اپریل ۱۹۳۹ء (۴) لا اقسم بھذا البلد مئی ۱۹۳۹ء

موعظہ حسنہ: (۱) تقوئی (دو قسطوں میں) فروری ومارچ ۱۹۳۷ء (۲) خلوص اکتوبر ۱۹۳۷ء (۳) مومن قرآن کے آئینے میں اگست ۱۹۳۹ء

۱۳-استاذ راشد رستم (۳۰)

مقالات: (۱) مسلمانان روس جون ۱۹۳۹ء

۱۴-مولانا سید سلیمان ندویؒ (۳۱) (متوفی ۱۹۵۳)

مقالات: (۱) مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم پر غوغائے تکفیر-اگست ۱۹۳۶ء، (۲) اسلام اور بہائیت (پانچ قسطیں) فروری تا جون ۱۹۳۷ء، (۳) مولانا حمید الدینؒ (دو قسطیں) (۳۲) نومبر و دسمبر ۱۹۳۷ء

۱۵-مولانا حافظ عبد الاحد اصلاحی (۳۳) (متوفی ۱۹۴۱ء)

معارف قرآن: (۱) اقسام القرآن (دو قسطیں) نومبر و دسمبر ۱۹۳۶ء (۲) ہدایت کا مفہوم اور اس کے اقسام ستمبر ۱۹۳۸ء (۳) حسد اور اس کے اثرات نومبر ۱۹۳۸ء

مذاکرہ: (۱) وانہ لعلم للساعۃ الخ کی صحیح تاویل مئی ۱۹۳۶ء (۲) سورۂ فتح کی ایک آیت کی تاویل جولائی ۱۹۳۶ء

موعظہ حسنہ: (۱) ہماری عملی زندگی پر عقیدۂ قیامت کا اثر جنوری ۱۹۳۷ء (۲) ایفائے عہد اسلام اور تہذیب جدید کی نظر میں اکتوبر ۱۹۳۷ء (۳) روزہ نومبر ۱۹۳۷ء

مقالات: (۱) پروپیگنڈہ جون ۱۹۳۹ء (۲) تبلیغ اور پروپیگنڈہ جولائی ۱۹۳۹ء

تلخیصات: (۱) امید و یاس مارچ ۱۹۳۶ء

۱۶-مسٹر عبد الحکیم (۳۴) (متوفی ۱۹۹۷ء)

تلخیصات: (۱) یورپ کا اخلاقی زوال اگست ۱۹۳۷ء (۲) فلسطین ستمبر ۱۹۳۷ء (۳) مسلمان برطانوی عہد حکومت میں جون ۱۹۳۸ء (۴) سندھ کے اسلامی آثار جون ۱۹۳۸ء

۱۷-مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی بی-اے (۳۵)

مقالات: (۱) کتب خانہ اسکندریہ اور حضرت عمر فاروقؓ مارچ ۱۹۳۸ء، (۲) اشتراکیت پر ایک سرسری نظر (تین قسطیں) جولائی تا ستمبر ۱۹۳۸ء (۳) عربوں اور یہودیوں میں کشمکش کے اسباب جنوری ۱۹۳۹ء

تلخیصات: (۱) چڑیوں کا گھونسلا ستمبر ۱۹۳۶ء، (۲) پیشہ نومبر ۱۹۳۶ء، (۳) جاپان

کی ترقی کا راز فروری ۱۹۳۷ء، (۴) آئندہ جنگ کا نقطۂ آغاز اپریل ۱۹۳۷ء، (۵) صحافت اور یورپ مئی ۱۹۳۷ء، (۶) جرمنی میں علوم قرآن کا مطالعہ جولائی ۱۹۳۷ء (۷) اشتراکیت کی ناکامی اگست ۱۹۳۷ء، (۸) کتاب مقدس کا سب سے بڑا لغت اگست ۱۹۳۷ء، (۹) کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا اگست ۱۹۳۷ء، (۱۰) آرزوؤں کا جال جنوری ۱۹۳۸ء، (۱۱) اہل علم کی خصوصیات اپریل ۱۹۳۸ء

تقریظ و تبصرہ: (۱) مارچ ۱۹۳۷ء (۲) مئی ۱۹۳۷ء

۱۸-جناب عبد اللطیف اعظمی (۳۶)

مقالات: (۱) اسلام کا اثر عربی شاعری پر مئی ۱۹۳۷ء (۲) اسلامی فتوحات اور قوموں کے اختلاط کا اثر عربوں پر جولائی ۱۹۳۷ء (۳) عربوں اور ترکوں کے اختلاط پر ایک تاریخی نظر فروری ۱۹۳۸ء

تلخیصات: (۱) افلاس کا اثر دماغ پر اپریل ۱۹۳۶ء (۲) ڈکٹیٹر کی نفسیات جون ۱۹۳۶ء (۳) مدرسۃ الاصلاح (۳۷) ستمبر ۱۹۳۶ء (۴) یورپ اور امریکہ کے عجیب و غریب مدرسے جولائی ۱۹۳۸ء

تقریظ و تبصرہ: (۱) مئی ۱۹۳۶ء (۲) اگست ۱۹۳۶ء

۱۹-مولانا عبد اللہ رشید نواب رشد کی (۳۸)

مقالات: (۱) فلسفۂ اجتماع اکتوبر ۱۹۳۹ء

۲۰-مولانا عبد الماجد دریابادی (۳۹) (متوفی ۱۹۷۷ء)

مقالات: (۱) علم و مذہب نومبر ۱۹۳۸ء

تلخیصات: (۱) قرآن مجید اور موجودہ اثری تحقیقات اپریل ۱۹۳۸ء

۲۱-مولانا عزیز الرحمان اصلاحی (۴۰) (متوفی ۱۹۷۱ء)

موعظہ حسنہ: (۱) بنیادی رذائل (دو قسطیں) مارچ و اپریل ۱۹۳۸ء

مقالات: (۱) ٹیونس (ماخوذ) اگست ۱۹۳۹ء

تلخیصات: (۱) مولانا حمید الدین فراہیؒ (۴۱) اکتوبر ۱۹۳۶ء (۲) حقیقی آزادی کیا

ہے؟ نومبر ۱۹۳۶ء، (۳) عبقریین کا طریقہ زندگی جنوری ۱۹۳۷ء، (۴) موجودہ دنیائے سیاست کے عناصر اربعہ اگست ۱۹۳۷ء، (۵) جرمنی میں آزادی نسواں کا حشر مئی ۱۹۳۸ء، (۶) آمریت کا طریقہ کار ستمبر ۱۹۳۹ء، (۷) فرانس کا جدید میلان ستمبر ۱۹۳۹ء، (۸) گزشتہ جنگ کے اسباق ستمبر ۱۹۳۹ء، (۹) بدن کا شیطان اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۱۰) عبقریت اور اخلاق اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۱۱) بخل و حرص اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۱۲) مایوسوں کا سہارا اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۱۳) جنگ میں پروپیگنڈہ کا ہتھیار نومبر ۱۹۳۹ء

تقریظ وتبصرہ: (۱) ستمبر ۱۹۳۶ء، (۲) اکتوبر ۱۹۳۶ء، (۳) اپریل ۱۹۳۷ء، (۴) اگست ۱۹۳۷ء، (۵) ستمبر ۱۹۳۷ء، (۶) نومبر ۱۹۳۷ء، (۷) دسمبر ۱۹۳۷ء، (۸) جنوری ۱۹۳۸ء، (۹) مئی ۱۹۳۸ء، (۱۰) جون ۱۹۳۸ء، (۱۱) ستمبر ۱۹۳۸ء، (۱۲) نومبر ۱۹۳۸ء، (۱۳) مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء، مشترکہ شمارہ (۱۴) مئی ۱۹۳۹ء، (۱۵) جون ۱۹۳۹ء، (۱۶) جولائی ۱۹۳۹ء، (۱۷) اگست ۱۹۳۹ء، (۱۸) ستمبر ۱۹۳۹ء، (۱۹) اکتوبر ۱۹۳۹ء، (۲۰) نومبر ۱۹۳۹ء

۲۲-چودہری غلام احمد پرویز (۴۲) (۱۹۰۳ء-۱۹۸۵ء)

معارف قرآن: (۱) تمسک بالکتاب جنوری ۱۹۳۶ء

مذاکرہ: (۱) نظر بر استدراک اگست ۱۹۳۷ء

موعظہ حسنہ: (۱) ایمان بلا عمل جولائی ۱۹۳۶ء

مقالات: (۱) اسلام اور غیر مسلم اقوام (دو قسطیں) مارچ و اپریل ۱۹۳۶ء، (۲) نجات اپریل ۱۹۳۷ء

تقریظ وتبصرہ: (۱) تفسیر سورۂ لہب (فراہی) پر تبصرہ فروری ۱۹۳۷ء

۲۳-مولوی حافظ سید محمد طٰہٰ اشرف استھنوی (۴۳)

مذاکرہ: (۱) مصدقا لما بين يديه (مولانا بدرالدین اصلاحی کے مضمون پر تنقید) مارچ ۱۹۳۷ء، (۲) مصدقا لما بين يديه (مولانا بدرالدین اصلاحی کے جواب کا جواب) جنوری ۱۹۳۸ء، (۳) بلاغ الحق (اسی نام کی ایک کتاب پر سات قسطوں میں تنقید،

جس کے آخر میں مدیر الاصلاح نے استدراک لکھا تھا) اپریل ۱۹۳۸ء تا اکتوبر ۱۹۳۸ء

۲۴-مولوی محمد عمر صاحب نعمانی شملہ (۴۴)

معارف قرآن: (۱) تاریخ اور قرآن کریم دسمبر ۱۹۳۶ء

۲۵-استاذ محمد فرید ابو حدید (۴۵)

مقالات: (۱) فرعون موسیٰ مئی ۱۹۳۹ء

۲۶-مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی (۴۶)

حکمت غرب

(۱) مارکس آریلیس کے خیالات (۱۷ قسطیں) دسمبر ۱۹۳۷ء تا جولائی ۱۹۳۸ء، ستمبر و نومبر ۱۹۳۸ء، جنوری ۱۹۳۹ء، مارچ و اپریل تا جولائی ۱۹۳۹ء، ستمبر و نومبر ۱۹۳۹ء

الاصلاح کے شعراء: الاصلاح میں عموماً ادبیات کا صفحہ بھی ہوتا تھا، اس حصہ میں ملک کے ممتاز شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا، مضمون نگاروں کی طرح ان کے نام ان شماروں کی تصریح کے ساتھ دیے جاتے ہیں جن میں ان کی منظومات شائع ہوئی تھیں:

۱-مرزا احسان احمد (۴۷) (متوفی ۱۹۷۲ء)

ادبیات: (۱) غزل مارچ ۱۹۳۷ء، (۲) غزل اکتوبر ۱۹۳۷ء، (۳) غزل دسمبر ۱۹۳۷ء، (۴) غزل مئی ۱۹۳۸ء، (۵) غزل مئی ۱۹۳۹ء، (۶) کیا ہوں نومبر ۱۹۳۸ء، (۷) نذر عقیدت فروری ۱۹۳۹ء

۲-مولانا اقبال احمد خاں سہیل (۴۸) (متوفی ۱۹۵۵ء)

ادبیات: (۱) غزل اپریل ۱۹۳۶ء، (۲) غزل مئی ۱۹۳۶ء، (۳) غزل جولائی ۱۹۳۶ء، (۴) غزل اگست ۱۹۳۶ء، (۵) شورش پیہم کا طالب ہے جہان زندگی نومبر ۱۹۳۶ء، (۶) کلام سہیل جولائی ۱۹۳۷ء، (۷) کلام سہیل ستمبر ۱۹۳۷ء، (۸) رسالت اور خاصان رسالت جنوری ۱۹۳۸ء، (۹) کلام سہیل جنوری ۱۹۳۹ء، (۱۰) افادات مولانا سہیل مئی ۱۹۳۹ء

۳-جناب برکت علی خاں فراق (۴۹) (متوفی ۲۷/ جنوری ۱۹۷۷ء)

ادبیات: (۱) غزل اپریل ۱۹۳۶ء

۴- حضرت بے خود دہلوی (۵۰) (متوفی ۱۹۵۵ء)

ادبیات: (۱) کلام بے خود دسمبر ۱۹۳۷ء (۲) غزل جنوری ۱۹۳۸ء

۵- استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ (۵۱) (متوفی ۱۹۳۰ء)

ادبیات: (۱) کلید حافظ (فارسی) فروری ۱۹۳۶ء (۲) چند متفرق اردو اشعار مارچ ۱۹۳۶ء، (۳) ایک غیر مطبوعہ غزل (فارسی) جون ۱۹۳۶ء (۴) غیر مطبوعہ غزل (فارسی) ستمبر ۱۹۳۶ء (۵) غزل (فارسی) دسمبر ۱۹۳۶ء (۶) غزل (فارسی) جنوری ۱۹۳۷ء (۷) غزل (فارسی) فروری ۱۹۳۷ء

۶- جناب دل شاہ جہاں پوری (۵۲) (متوفی ۱۹۵۹ء)

ادبیات: (۱) غزل مارچ ۱۹۳۸ء (۲) غزل اگست ۱۹۳۸ء

۷- فراق (رگھوپتی سہائے) گورکھ پوری (۵۳) (متوفی ۱۹۸۲ء)

ادبیات: (۱) غزل مارچ ۱۹۳۸ء (۲) آج بھی جون ۱۹۳۸ء

۸- جناب کیفی چریاکوٹی (۵۴) (متوفی ۱۹۵۶ء)

ادبیات: (۱) غزل اگست ۱۹۳۷ء

۹- جناب یحییٰ اعظمی صاحب (۵۵) (متوفی ۱۹۷۲ء)

ادبیات: (۱) نذر عقیدت بہ ارواح طیبات الاستاذین الامامین العلامہ شبلیؒ النعمانی و مولانا حمید الدین الفراہیؒ جنوری ۱۹۳۶ء (۲) دعا اکتوبر ۱۹۳۶ء (۳) غزل مارچ ۱۹۳۷ء (۴) مسلمانان ہند سے خطاب مئی ۱۹۳۷ء (۵) خیر مقدم (مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی تشریف آوری پر) جنوری ۱۹۳۸ء (۶) آہ! اقبال (مرثیہ) مئی ۱۹۳۸ء

الاصلاح کی ایک اور خصوصیت: الاصلاح کے مضامین مسلسل صفحات پر شائع ہوتے تھے، عام رسالوں کی طرح یہ نہیں لکھا جاتا تھا کہ باقی مضمون فلاں صفحہ پر ملاحظہ ہو، اگر کوئی مضمون صفحہ کے درمیان پر ہی ختم ہو جاتا تو باقی صفحہ پر کوئی مفید اقتباس یا کتابوں اور رسالوں کے اشتہارات وغیرہ دیے جاتے تھے، اقتباسات قرآن مجید کے متعلق ہوتے تھے، امام غزالیؒ کے حسب ذیل

اقتباسات بہ تصریح ذیل ہیں:

(۱) سورۂ اخلاص ثلث قرآن ہے (جنوری ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۹)۔

(۲) قرآن میں تکرار نہیں فروری ۱۹۳۶ء، صفحہ ۵۷

(۳) جنوری ۳۶ء میں صفحہ ۳۹ پر "سورۂ فاتحہ تمام اصولی مباحث پر مشتمل ہے" کے عنوان سے مشہور مصری عالم محمد عبدہ کی تحریر درج ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے مندرجہ ذیل اقتباسات دیے گئے ہیں:

(۱) قرآن کی دعوت عقل و بصیرت پر مبنی ہے (فروری ۱۹۳۶ء، صفحہ ۲۵)۔

(۲) تقرب الی اللہ (فروری ۱۹۳۶ء، صفحہ ۳۸)۔

(۳) قرآن میں حذف (مارچ ۱۹۳۶ء، صفحہ ۵۸)۔

(۴) قرآن مجید بحر ناپیدا کنار ہے (جولائی ۱۹۳۷ء، صفحہ ۲۰۳/۲۰)۔

(۵) قرآن مجید ایک اعلا کلام ہے (اگست ۱۹۳۷ء، صفحہ ۴۳/۲۵)۔

مضامین کے نیچے خالی رہ جانے والے صفحہ پر مولانا فراہی کی عربی تصنیفات یا ان کے اردو ترجموں کا اشتہار عموماً ہوتا تھا لیکن کبھی دوسرے اہل قلم و مصنفین کی تصنیفات کا اشتہار بھی ہوتا تھا، دارالمصنفین اور جامعہ ملیہ کے مکتبوں کی کتابوں کا اشتہار بھی دیا گیا ہے جن جرائد و رسائل کے اشتہارات ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہفت روزہ صدق (لکھنؤ)، ماہنامہ فاران (بجنور)، پیام تعلیم (دہلی)، پندرہ روزہ مسلم (پٹنہ)، ماہنامہ ترجمان القرآن (حیدرآباد، پھر پٹھان کوٹ)، ہفت روزہ غنچہ (بجنور)، ماہنامہ البیان (امرت سر)۔

الاصلاح کے اشتہاروں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دائرہ حمیدیہ کی ایک ایجنسی لاہور میں تھی، جہاں سے اس کی تمام اردو مطبوعات اور الاصلاح اصلی قیمت پر ملتے تھے، نومبر ۱۹۳۸ء، صفحہ ۱۹۲ اور جنوری ۱۹۳۹ء، صفحہ ۶۴ کے اشتہارات میں اس کا ذکر ہے۔

الاصلاح کی مدت اشاعت: الاصلاح کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۳۶ء میں نکلا تھا اور نومبر ۱۹۳۹ء کا شمارہ نکلنے کے بعد وہ بند ہو گیا، اس عرصہ میں وہ کبھی خود کفیل نہیں ہو سکا، بار بار اس کے بند

کیے جانے کے اندیشے ظاہر کیے جاتے تھے اور بعض دفعہ بند کیے جانے کا اعلان بھی کر دیا گیا لیکن اس کے مربیوں اور سرپرستوں کو اس کا بند کیا جانا گوارا نہیں تھا، چنانچہ ان کی ہمدردی اور سرپرستی اور وقتی امداد اس کی زندگی اور بقا کی صورت پیدا کر دیتی تھی، جن حضرات کی امداد و عطیہ سے الاصلاح چار برس تک قرآن مجید کی خدمت کرتا رہا، ان کا ذکر الاصلاح میں بار بار آیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

۱- ڈاکٹر حاجی حفیظ اللہ صاحب (صدر دائرہ حمیدیہ) ۲- مولوی عبدالغنی کمشنر انکم ٹیکس (نائب صدر دائرہ حمیدیہ) ۳- مولوی حفیظ احمد صاحب (رکن دائرہ حمیدیہ) ۴- شیخ سلیمان مرزا پوری مقیم برما (ہمدرد دائرہ حمیدیہ)۔

لیکن الاصلاح کے اڈیٹر اور اس سے وابستہ دوسرے حضرات کو یہ عارضی صورت پسند نہیں تھی اور وہ اپنے سرپرستوں کو اس کی کفالت کی زحمت سے بچانے کے لئے اس کی بار بار اپیل کرتے تھے کہ ہر خریدار ایک اور خریدار مہیا کر دے تو الاصلاح جاری رہ سکتا ہے مگر یہ اپیل رائگاں گئی اور بالآخر ۱۹۳۹ء کے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔

الاصلاح انگریزی مہینوں کی ۱۵ ر تاریخ کو شائع ہوتا تھا مگر کبھی کبھی اس کی اشاعت میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی جس کے اسباب بھی الاصلاح میں مذکور ہیں، ہر شمارہ منفرداً شائع ہوتا تھا، صرف مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء کا شمارہ مشترکہ ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں مدرسہ کے آس پاس کی تمام بستیاں مسلسل کئی ماہ سے وبائے طاعون کے نرغے میں تھیں، اس طرح تقریباً چار مہینے انتشار، تعطل اور خانہ بدوشی میں گزرے اور مدرسہ و دائرہ دونوں کا نظام درہم برہم رہا اور مارچ بھر پریس بند رہا۔

چار برس کے عرصے میں صرف یہ دو شمارے شائع نہیں ہو سکے، دسمبر ۱۹۳۸ء، دسمبر ۱۹۳۹ء اور ان کی جگہ مولانا فراہیؒ کی کوئی عربی تصنیف شائع کر کے اردو الاصلاح کی جگہ خریداروں اور قدردانوں کو بھیجی گئی، نومبر ۱۹۳۸ء کے الاصلاح میں اس کی اطلاع بھی کر دی گئی تھی کہ دسمبر ۱۹۳۸ء کے الاصلاح میں اردو مضامین نہ ہوں گے، استاذ امامؒ کے مسودات میں سے تفسیر نظام القرآن کے ابتدائی اجزا شائع کیے جائیں گے اور وہی الاصلاح کے خریداروں کو دسمبر کے

شمارہ کی جگہ بھیجے جائیں گے، اس کی تصریح بھی ہے کہ مولانا کے اجزائے تفسیر اور مسودات کی اشاعت کا یہ طریقہ مجبوراً اختیار کیا گیا ہے، ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے کہ ان کی باقاعدہ اور مستقل اشاعت کا اہتمام کر سکیں، پس شائقین کی خاطر سے الاصلاح کے صفحات ہی میں ان کی اشاعت کا نظم کیا گیا، اگر پردۂ غیب سے کوئی اور سامان نہ ہو سکا تو جب تک الاصلاح جاری ہے سال کی ایک دو اشاعتیں اس کے لیے مخصوص رہیں گی۔ (۵۶)

دسمبر ۱۹۳۹ء کا الاصلاح بھی اسی بنا پر شائع نہیں کیا گیا، جس کی صراحت نومبر ۱۹۳۹ء میں اس طرح ہے:

"پچھلے سال دسمبر میں الاصلاح کے خریداروں کو فاتحہ نظام القرآن نذر کیا گیا تھا، امسال استاذ امام کے غیر مطبوعہ رسائل میں سے اصول التاویل، کتاب الاسالیب اور مفردات القرآن پیش کرنے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ اس ارادے کو پورا کرے"۔ (۵۷)

لیکن صرف مفردات القرآن ہی اس وقت شائع ہوئی تھی باقی دونوں کتابیں بہت عرصہ بعد شائع ہوئیں اور ان کی اشاعت کا سہرا مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم سابق ناظم دائرہ حمیدیہ کے سر رہا۔

غرض نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد الاصلاح کا کوئی اور شمارہ شائع نہیں ہوا، سوا برس بعد ۱۹۴۱ء میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی ادارت میں سہ ماہی اصلاح نکلا لیکن یہ ایک ہی سال بعد بند ہو گیا، یہ رسالہ قوم کو مدرسہ کے حالات و کوائف سے واقف کرانے کے لیے جاری کیا گیا تھا جس میں دو ایک مفید اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

☆☆☆☆

الاصلاح کے شذرات

شذرات ابھی تک الاصلاح کے عام مشمولات کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن اس کے افتتاحیے اور شذرات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے جن میں موجودہ حالات ومسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کی جاتی تھی، اس کے ذکر کے بغیر الاصلاح کا مکمل تعارف نہیں ہوسکتا، یہ شروع میں تین اور پانچ صفحے کے بھی ہوتے تھے لیکن بعد میں عموماً سات صفحات پر مشتمل ہوتے تھے اور کبھی اس سے بھی زیادہ جس کو آخر میں دیا جاتا تھا۔

الاصلاح کے شذرات مختلف نوعیتوں کے ہوتے تھے اور ان میں قومی وملی مسائل زیر بحث آتے تھے، ان نوعیتوں کو ہم نمبروار ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ خود الاصلاح کے تعلق سے ان شذرات میں مختلف امور بیان کئے جاتے تھے، مثلاً اس کے پہلے شمارے میں اس کے اجرا کے محرک ومقصد، اس کے خاص محرکین، معاونین اور سرپرستوں وغیرہ کا ذکر اور دائرہ حمیدیہ کے قیام کی روداد اور اس کے اغراض ومقاصد کی تفصیل بیان کی گئی ہے، دوسرے شمارے میں ایک طرف الاصلاح کی پذیرئی وحوصلہ افزائی کا ذکر ہے تو دوسری طرف ان شکایتوں کا ذکر ہے کہ اس کے مضامین دقیق اور مشکل ہوتے ہیں جو عام فہم نہیں ہوتے پھر ان شکایتوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا جاتا کہ اس کے اجرا کا مقصد کیا ہے، یہ سلسلہ وقفے وقفے سے شذرات میں برابر چلتا رہتا، بالکل عوامی سطح پر الاصلاح کو نہ لانے کی وجہ سے وہ اکثر مالی مشکلات میں مبتلا ہوجاتا تھا اور اس کے بند ہوجانے کا اندیشہ ہونے لگتا، اس پر اس کی توسیع اشاعت کی اپیل کی جاتی اور جب کوئی متوقع یا غیر متوقع امداد مل جاتی تو اس کا ذکر شکر و امتنان کے جذبے سے کیا جاتا، یہ تمام تفصیل چونکہ شروع میں آچکی ہے اس لئے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ شذرات میں الاصلاح کے تعلق سے پیدا ہونے والے امور ومسائل کے علاوہ دائرہ حمیدیہ سے متعلق مسائل کا عموماً تذکرہ ہوتا تھا، جس کا وہ آرگن تھا، اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں، اس کا قیام کس لئے عمل میں آیا، اس کی ذمہ داریاں کن حضرات کو تفویض کی گئی ہیں، وہ کیا کام انجام دے رہا ہے، آگے کون سے کام اس کے پیش نظر ہیں، مولانا فراہی کی کون سی کتابیں چھپ گئی ہیں اور کن کی اشاعت زیر عمل یا زیر غور ہے، دائرہ کن مشکلات اور مالی دشواریوں میں ہے، اس ضمن میں سرپرستوں اور معاونین کے عطیات کا ذکر اور اس کے نئے ہمدردوں اور معاونین کا تذکرہ کیا جاتا، اس کی بھی کسی قدر تفصیل پہلے گزر چکی ہے، اس لئے اسے بھی قلم انداز کیا جاتا ہے۔

۳۔ الاصلاح گو مدرسۃ الاصلاح کا آرگن نہیں تھا تاہم اس کے تعلق سے بھی شذرات میں متعدد چیزیں زیر بحث آتی رہتی تھیں، مثلاً اس کی مسجد اس کی بورڈنگ اور کتب خانے کی تعمیر کے لئے اپیل بار بار کی گئی ہے، برما اور ملایا وغیرہ میں مالیات کی فراہمی کے لئے مدرسے کے وفود بھیجے جاتے یا مدرسے کے اساتذہ وطلبہ ضلع وبیرون ضلع میں چندے کی وصولی کے لئے روانہ ہوتے تو اس کا ذکر کر کے تعاون کی درخواست کی جاتی، بعض حضرات کے خصوصی تعاون کا تذکرہ کیا جاتا، مدرسہ میں ہونے والے جلسوں کی کارروائی اور معزز مہمانوں کی تشریف آوری کا ذکر بھی الاصلاح کے شذرات میں موجود ہے، ایک جگہ بچوں کے دارالاقامہ کے سنگ بنیاد کی تقریب کا ذکر بڑے پراثر انداز میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''بچوں کے دارالاقامہ کا سنگ بنیاد جمعہ ۲۷ رمئی ۱۹۳۸ء کو بانی مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیعؒ کے ہاتھوں رکھا گیا، وہ عرصہ سے معذور اور خانہ نشین تھے، اس کے لئے مدرسۃ الاصلاح لایا گیا، اساتذہ وطلبہ جمعہ بعد ایک کری پر بٹھا کر نیو کے پاس لے گئے، انہوں نے پہلی اینٹ رکھی، اس حالت میں کہ آنکھیں اشک بار، زبان مشغول دعا اور ہاتھ کانپ رہے تھے، اس کے بعد دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں ایسے ایام جشن ومسرت کے ہوتے ہیں لیکن مومن کا نقطۂ نظر ہر گوشہ میں دوسروں سے

مختلف ہے، وہ جب زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں زیادہ سے زیادہ آنسو
بہاتی ہیں، پس کامیابیوں اور فتح مندیوں کی کسی منزل میں بھی وہ مغرور نہیں
ہوتا، مولانا کی آنکھوں میں فتح مندی کی تمکنت کی جگہ جذبہ شکر وسپاس کے آنسو
جھلک رہے تھے"۔(۵۸)

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانیؒ و مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تشریف آوری

۴۔مدرسے میں معزز اور بزرگ مہمانوں کا ورود مسعود ہوتا تو اس کا تذکرہ بھی الاصلاح کے شذرات میں کیا جاتا، ایک دفعہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے جلسۂ انتظامیہ میں شرکت کے لئے آئے تھے تو ناظم مدرسہ مولوی حاجی رشید الدین انصاریؒ کی دعوت پر دونوں حضرات یہاں بھی تشریف لائے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شذرات میں لکھا گیا کہ شروع میں مدیر الاصلاح کی تقریر ہوئی، پھر مولوی محمد یحییٰ اعظمی کی لکھی ہوئی خیر مقدمی نظم پڑھی گئی، اس کے بعد مولانا شروانی کا موثر اور دل نشین وعظ ہوا، مولانا عبدالماجد صاحب نے تقریر نہیں کی، طلبہ نے دارالمعلومات[1] کا رجسٹر دستخط کے لئے بڑھایا تو انہوں نے مثنوی کا شعر:

صد کتاب و صد ورق در نار کن　　　سینہ را از نور حق گل زار کن

لکھ کر دستخط فرمائے۔(۵۹)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

ان کے مدرسۃ الاصلاح کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشنے کا ذکر "غریب شہر" کے بلیغ عنوان سے کیا ہے، استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہیؒ سے ان کے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات تھے، نیز مدرسہ کے قیام کے بالکل ابتدائی ایام میں مولانا شبلی نعمانیؒ کی دعوت پر ایک مرتبہ مولانا اس ویرانے کو نواز چکے تھے، ان گوناگوں روابطِ اخلاص کو طویل مفارقت اور جلاوطنی کے بعد بھی مولانا نے بھلایا نہیں اور ہندوستان آنے کے بعد اپنی دوسری مصروفیتوں پر یہاں کی تشریف آوری کو مقدم رکھا اور اپنے دیرینہ نیازمندوں کو مفتخر فرمایا، پھر چار پانچ صفحوں میں ان کے متعدد امتیازات وخصائص بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

[1] طالب علموں کے کتب خانے کا نام ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا علم نہایت گہرا ہے اور ان کی رائیں برسوں تک ان کے دماغ میں پک کر نکلی ہیں، ایک وسیع تجربہ، ایک وسیع مطالعہ، ایک مفکر دماغ، ایک ڈوب جانے والی عقل اور مستقبل کے پردوں کو چاک کر کے دیکھنے والی نظر ان کے ساتھ ہے، پس وہ جو کچھ کہتے ہیں، کسی مرعوبانہ ذہنیت اور عاجلانہ تاثر کا نتیجہ نہیں ہے، فکر ومطالعہ اور تجربہ ومشاہدہ کا نچوڑ ہے، بڑی ناانصافی ہوگی، اگر ان کو سمجھنے کے لیے ہم جلد بازی کریں اور انتہائی ظلم ہوگا اگر ان کو کسی پارٹی کا آدمی سمجھا جائے اور اس کی وجہ سے ان کو قریب سے دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے، ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ مولانا کی بعض تقریروں اور تحریروں کی بنا پر جن لوگوں نے ان کے سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ سخت غلط فہمی میں ہیں اور وہ لوگ بھی ان کی نسبت کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکے ہیں جنہوں نے ان سے عاجلانہ تبادلہ خیال کیا ہے، ان کو سمجھنے کے لئے صبر وسکون کے ساتھ ان کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ہمیں خود مولانا کی بعض باتوں سے اختلاف ہے لیکن وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے لئے ان کے پاس دلائل ہیں، ضرور نہیں کہ ہم ان کے دلائل سے متفق بھی ہوں مگر نفس دلائل سے انکار ناممکن ہے، وہ بے لچک ضرور ہیں مگر اس حد تک نہیں کہ دوسروں کے دلائل نہ سن سکیں مگر تری سکاٹی ان کو قائل نہیں کر سکتی، اگر ہمت کر کے ان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اپنے دل کے دروازے کھول دیتے ہیں اور ایسی بے لوث محبت سے باتیں کرتے ہیں کہ آدمی ساری تلخیوں کو بھول جاتا ہے۔

مولانا ایک کٹر مذہبی مجاہد ہیں، شیخ الہند[1] کے خاص معتقد رہ چکے ہیں، یورپ میں قیام کے باوجود صورتاً "ملا" ہیں، ان کی ہر بات میں ایمان واسلام کی گرمی ہے، ہر مشکل میں خدا سے التجا کر کے رو پڑنا کامیابی کی کلید جانتے ہیں، قرآن ان کی ساری زندگی میں غور وفکر کا موضوع رہا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے بلا اختلاف وہ اس وقت سب سے بڑے عالم ہیں، وہ کہاں جا رہے ہیں اور ہم کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں، یہ باتیں ان سے پوچھنے اور سمجھنے کی ہیں۔

مولانا کسی خاص پارٹی کے نقیب نہیں ہیں، قرآن کی حکومتِ عدل کے قیام کے داعی ہیں، اس منزل تک وہ کس طرح پہنچیں گے اور کن راہوں سے ہو کر گزریں گے، ان سوالوں کا وہ

[1] یعنی مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔

جواب دیتے ہیں۔

مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ کے اندر وقت کا ہادی پالیا ہے، وہ ان کے نزدیک قرآن کی حکمت وسیاست کے بہترین شارح ہیں، وقت کی عقلیت اور ''یہودی ساحر'' کا توڑ صرف شاہ ولی اللہ کی حکمت میں ہے، یہی چیز آنے والے انقلاب میں مسلمانوں کو قیادت کی جگہ دلائے گی، بین الاقوامی انقلاب کے عالم گیر تلاطم میں ان کے دین کی حفاظت کرے گی اور ساری دنیا کو ایمان واسلام کے لئے سازگار بنائے گی اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کو جس قدر بہتر مولانا نے سمجھا ہے، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ ہمارے نزدیک شاہ صاحب کے فلسفہ کا درس ومطالعہ بجائے خود ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے، پس اس خدمت میں الاصلاح اگر کچھ شرکت کر سکے تو یہ اس کے لئے موجب سعادت دارین ہے، ان کی صحبت میں پہلی مرتبہ یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب نے اس وسعت کے ساتھ ہماری پیش آنے والی ضروریات پر غور فرمایا ہے۔

مولانا کے یقین میں بڑی کشش اور قوت ہے، ان کی رایوں میں تردد کا شائبہ اور اضطراب کا پھس پھسا پن نہیں ہے، بعض اوقات یہ یقین جوش میں آجاتا ہے اور تند ہو کر ان کو اپنے مخالفوں کے لئے سخت گیر بنا دیتا ہے، کاش ان میں یہ بات نہ ہو مگر ہم ان کا عذر بھی جانتے ہیں، وہ اپنی راہ منزل کے آثار تک دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، پیچھے رہ جانے والوں اور پیچھے رہ جانے کی دعوت دینے والوں کے انجام کو جانتے ہیں، اسی لئے وہ لوگوں کو سرزنش کرنے میں مصلحت بیں اور اعتدال پسند نہیں ہو سکتے، پھر اگر قوم کی محبت ان کو دیوانہ بنا دے تو کیا تعجب ہے۔

مولانا قرآن کا رشتہ نسل وقوم وجماعت سے کاٹ کر انسانیت اور عقل سے جوڑنا چاہتے ہیں، قرآن پورے روئے زمین پر اس وقت برسا تھا جب دنیا اور اس کی عقل اس کے لئے پیاسی تھی، آج بھی دنیا اور انسانیت اس کے لئے پیاسی ہے، مولانا چاہتے ہیں کہ آج بھی قرآن سے مگر زمین کے گرد وغبار اور اس کی کثافتوں سے پاک ہو کر، دنیا کی پکار کا جواب بن کر، روح کے لئے پیام تسلی بن کر، عقل کے لئے طمانیت لے کر، پیٹ کے لئے غذا بن کر، فرد کے لئے زندگی

بن کر، سماج کے لئے نظام بن کر اور ساری دنیا کے لئے ابر کرم بن کر، اس کے لئے وہ ایک عملی پروگرام رکھتے ہیں جس کا کم سے کم حاصل ان کے نزدیک یہ ہے کہ قرآن کا نظام دنیا کا ذہنی اور عملی نظام بن جائے گا۔

مولانا اخباری ہنگاموں پر اعتقاد نہیں رکھتے، اپنا پروگرام بازاروں میں بکنے والی چیز نہیں بناتے، اگر چند ''خرد باختہ'' اور ''ناعاقبت اندیش'' بھی ان کے دل کے بھیدوں کو بجھ گئے تو ان کا مشن پورا ہو کے رہے گا، وہ مشورے کے لئے چند تجربہ کار بوڑھوں کے بھی متلاشی ہیں مگر ان کی نظر جوانوں پر ہے، وہ ان کے سامنے ان کا مستقبل دکھانا چاہتے ہیں، ظرافت کے انداز میں فرماتے ہیں، مجھے نوجوان چاہئیں تاکہ میں انہیں ''بگاڑ دوں'' اور غالباً اس جرم کی سزا میں سقراط کی طرح بوڑھوں کی عدالت سے سزائے موت کا فتویٰ سننے اور زہر کا پیالہ پینے کے لئے آمادہ ہیں۔

مولانا کا اقدام متہورانہ ہے، وہ سازگار ساعت کے انتظار میں نہ لیت ولعل اور نہ صالح کو زنجیر پا بننے دینا چاہتے ہیں، ان کی نظر آگے ہے، پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، ان کا ایمان ویقین ان کا رہبر ہے، ہماری دلی آرزو ہے کہ نوجوانوں کی فوج سے پہلے اگر ان کو چند دانائے راز اور ہمت ور بوڑھوں کی رفاقت حاصل ہو جائے تو وسط واعتدال کی ایک شاہراہ پر ہم چل پڑیں گے۔

مولانا سے جن باتوں پر اختلاف ہو سکتا ہے وہ اساسی نہیں ہیں، سرسری ہیں اگر اصلی مقصد میں اتفاق ہو جائے اور اس کے لئے سچی سرگرمی ظہور میں آجائے تو مولانا ان جزئیات پر انشاء اللہ اصرار نہ کریں گے، اللہ تعالیٰ مولانا کی مدد کرے اور ان کی محنتوں کو ہماری آیندہ نسلوں کی دینی ودنیاوی ترقی کا فتح یاب بنائے''۔(۶۰)

مولانا سندھی نے کئی روز تک مدرسہ پر قیام فرمایا تھا، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے طول طویل صحبت وملاقات اور تبادلۂ خیالات واستفادے کے بعد یہ سطریں عجلت میں لکھی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ ہم نے مولانا سندھی کو جو کچھ سمجھا ہے، اس پر انشاء اللہ کبھی مفصل لکھیں گے مگر غالباً وہ یہ وعدہ وفا نہ کر سکے۔

علامہ موسیٰ جار اللہ ایک بیرونی معزز مہمان موسیٰ جار اللہ کی مدرسہ میں آمد اور تشریف آوری

کاذکر کرتے ہیں، وہ روس کے مشہور عالم، عربی، فارسی، ترکی، روسی اور غالباً فرنچ زبانیں جانتے تھے۔تفسیر، قرأت، ادب، نحو، فقہ اور اصول میں ماہرانہ ومجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، انہیں عالم اسلام کی پچھلی چوتھائی صدی کی تمام سیاسی ومذہبی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے اور بعض میں عملاً شریک ہونے کا شرف حاصل تھا، اس زمانے میں ہندوستان کی سیاحت کے لئے آئے تھے، اس سے پہلے بھی دوبار یہاں آچکے تھے، اس دفعہ مولانا فراہیؒ کے معارف اور مدرسہ دیکھنے کے لئے اس ویرانے میں بھی قدم رنجہ فرمایا، دودن تک ان سے دلچسپ صحبتیں رہیں، اس موقع پر ہندوستان میں عربی تعلیم کے نظام پر جو گفتگو رہی اس کے متعلق مولانا اصلاحی نے ان کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا، جس کا خلاصہ یہاں دیا جاتا ہے۔

عربی ودینی تعلیم علامہ موسیٰ جاراللہ نے یہ سوال کیا تھا کہ ہندوستان میں علوم عربیہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اور جس ڈھرے پر عربی مدارس چل رہے ہیں، اس کا آخری انجام کیا ہوگا، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے اس کے جواب میں تعلیم اور مدارس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، ہم اس سلسلے کی بعض باتیں نقل کرتے ہیں۔

عرصے سے عربی تعلیم کے غیر مفید ہونے کا عام احساس خود عربی تعلیم کے حامیوں کو بھی ہو چکا ہے مگر ان کی جانب سے اسے مفید وموثر بنانے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی، سرسید احمد خاں مرحوم نے عربی مدارس وعربی تعلیم کے باب میں جو خیالات ظاہر کئے تھے عربی تعلیم کے حامیوں کی طرف سے ان کی عملی تردید کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا، ان کے خیال میں اس راہ میں سب سے زیادہ مشکور مساعی علامہ شبلی کی ہیں لیکن انہوں نے اپنے زمانے میں اصلاح تعلیم ونصاب کی جو داغ بیل ڈالی، بعد والوں نے اس پر کوئی وسیع عمارت نہیں قائم کی بلکہ بنیاد کی اینٹوں کو یوں ہی برہنہ چھوڑ دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گردش روزگار نے ان کو بھی تتر بتر کر دیا ؂

عفت الدیار محلہا فمقامہا

مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ تعلیم کا کوئی جامد نظام باقی نہیں رہ سکتا، تعلیم کا مقصد انسانی ذہن ودماغ کی رہنمائی، افکار وخیالات کی قیادت اور زمانہ کی ہر آن بدلنے والے اور ہر لحہ گھٹنے بڑھنے والے حالات کے لحاظ سے اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ہزار راہوں سے

ایک متعین منزل تک پہنچ سکے اور وقت کی کوئی مشکل اس کے لئے ایسی نہ ہو جس کے لئے اس کے پاس تشفی بخش جواب نہ ہو، ہر زخم ہر خلش کے لئے اس کے شفاخانہ میں مرہم ہو، پیٹ اور عقل کے لئے اس کے پاس غذا ہو، وہ ہر آن بدلنے والا ہو لیکن اسے کبھی نہ بدلا جا سکے، ان کے نزدیک اسلامی نظام تعلیم کی اصل حقیقت وخصوصیت یہی ہے۔

عربی نظام تعلیم ان کے خیال میں اندر اور باہر دونوں طرف سے کھوکھلا ہے، اس کی دیوار کی اینٹوں میں پہلے ہی سے لونی لگی ہوئی تھی اور چھت کی کڑیاں اور شہتیر شروع ہی سے بوسیدہ تھے، اس سے زیادہ واضح لفظوں میں یہ ہماری اس دنیا کی ضرورتوں، اس کی حاجات اور اس کے مقتضیات سے اس قدر بعد ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی کو دھوکا ہوتا ہے کہ شاید مذہب آخرت میں برتنے کی چیز ہے، اس دنیا سے اس کو کوئی علاقہ نہیں حالاں کہ مذہب اسی دنیا میں برتنے کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو ہماری تمام مشکلوں میں رہبر ہونا چاہیے، اسلام کی تو اصل خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ ہماری زندگی کے ہر گوشہ کے لئے ایک مکمل دستور العمل ہے لیکن آج عربی مدرسوں کا طالب علم محسوس کرتا ہے کہ جو چیزیں وہ پڑھتا ہے، ان کا تعلق اس عالم سے نہیں ہے، اس کی تفسیر، فقہ، کلام، منطق، فلسفہ کوئی بھی چیز اس عالم میں کام آنے والی نہیں، اس حالت نے مدارس کے طلبہ کی ہمتیں پست کر دی ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کہاں جائیں کیا کریں، ہر راہ تنگ، ہر دروازہ بند، ہر معاملہ معما، ہر مسئلہ پراسرار، پھر بوالعجبی یہ کہ تمام عالم کی قیادت کا حق ان کو پہنچتا ہے، نتیجہ یہ کہ نادیدہ راہوں میں کود پڑتے ہیں، جہاں ان کو علانیہ اپنی بے بسی محسوس ہوتی ہے، بقول حماسی شاعرہ من الناس من یقضی علیہ ولا یقضی۔

علمائے مدارس پر سرسید نے طعن کیا تو علما نے اس کا انتقام تکفیر سے لیا حالاں کہ اگر اسی وقت وہ صحیح صورت معاملہ سمجھ لیتے تو یہ حالت نہ ہوتی، انہیں خیال ہوا کہ ہمارے ایک جگہ جم جانے سے ہماری خاطر سورج چاند بھی نہ ہلے گا لیکن زمانہ اور اس کے ساتھ افکار وخیالات کے تغیر نے یہاں تک پہنچایا کہ آج اس پر غور ہو رہا ہے کہ علما ہمارے کلچر اور تمدن کی حفاظت کے بھی اہل ہیں یا نہیں، انگریزی اسکول کے طلبہ بھی جو مسکین سیاست ومذہب کی ابجد تک سے ناآشنا ہیں، برملا کہتے ہیں کہ علما سیاست وقیادت کے اہل نہیں اور عوام بھی۔

لیکن یہ قصور کس کا ہے؟ زمانہ کا یا آپ کا، زمانہ تو ہمیشہ بدلا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہے گا، ہاں آپ اپنی جگہ پتھر کی طرح جم گئے، حالاں کہ انسان جامد اور غیر متحرک نہیں بنایا گیا ہے۔ (۶۱)

مدیر الاصلاح نے دینی تعلیم اور اس کے نصاب پر جا بہ جا شذرات میں اظہار خیال کیا ہے، ہم اس موقع پر ان کے کچھ افکار و خیالات یہاں نقل کرتے ہیں۔

مذہبی تعلیم اس زمانے کے کسی رسالے کے ایک مضمون نگار نے علما پر طعن و تشنیع اور زبان درازی کی تھی، اس کا ذکر کر کے عربی مدارس اور ان کے نصاب کی بحث چھیڑی ہے اور بتایا ہے کہ عربی مدارس کا نصاب کس طرح کا ہونا چاہیے، لکھتے ہیں:

"اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ عام طور پر عربی مدارس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور طلبہ کے سامنے جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں، ان کو ہماری موجودہ عملی زندگی کے احوال و مسائل سے بہت کم تعلق ہوتا ہے، ایسی حالت میں یا تو ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ہم انہیں جس عالم کی تعلیم دیتے ہیں، اسی عالم میں انہیں جینے اور زندگی بسر کرنے کے لئے بھی بھیج دیں اور اس عالم میں قدم بھی نہ رکھنے دیں یا یہ کریں کہ انہیں اس عالم کے احوال و مسائل سے بھی باقاعدہ آگاہ کریں، یہ کیا کہ ہم انہیں خشکی میں جینے کا تو ڈھنگ سکھاتے ہیں اور پھر اس دنیا کی سیاسیات کے سمندر میں لا کر ڈال دیتے ہیں، اس صورت حالات کے جو نتائج ہو سکتے تھے، وہ اب سامنے آ رہے ہیں اور حیف ہے کہ اگر ہمارے ارباب حل و عقد اب بھی اس پر غور نہ کریں، عربی مدارس کو موجودہ ڈھرے پر گھسیٹتے رہنا درحقیقت علما، مذہب، علوم اسلامیہ اور ان مدارس سب کا چند دنوں میں خاتمہ کر دینا ہے، اب اگر ان کو زندہ رکھنا ہے تو نصابوں اور طریق تعلیم کی تبدیلی میں ایک لمحہ کا توقف بھی موت کے مرادف ہے، دینی علوم کیا ہیں، قرآن، حدیث، قانون اسلامی ان کے علاوہ وہ نصابوں سے تمام غیر ضروری کتابوں کا بوجھ ہٹا کر جدید فلسفہ کی بعض ضروری اور مفید شاخوں اور انگریزی زبانوں کا اضافہ کرنا چاہیے، بعض عربی مدارس میں انگریزی کی چند ریڈریں جو پڑھائی

جاتی ہیں یہ بالکل مفید مقصد نہیں ہے، سرسید نے کالج میں مذہبی تعلیم بھی رکھی تھی جو بہ قول اکبر مرحوم "بادۂ گل گوں میں تھوڑی سی زمزم تھی" ہم نے اسی کو الٹ کر زمزم میں چند بوندیں بادۂ گل گوں کی ملا دیں، اس سے کیا ہوتا ہے اور جدید علوم و فنون تو علما ہی کے پڑھنے کے لئے تھے، یہی اس کے غث و ثمین کو پہچان سکتے تھے، یہ دینی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ کا فلسفہ جن لوگوں نے اختیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے کہ ان ہی کے بوئے ہوئے تخم فساد کے مسموم برگ و بار ہیں جن کے سایہ کے نیچے آج مذہب کا دم گھٹ رہا ہے۔

بہر حال ملک کے خاص خاص نمایاں عربی مدارس کو فوراً بدل جانا چاہیے، لوگوں میں پرانی لکیر کو چھوڑنے کی ہمت پیدا ہو جائے تو ہمارا خیال ہے کہ روپیہ کی مشکل کچھ بہت لاینحل نہیں ہے، قوم میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ عربی مدارس کی تعلیم مفید اور ترقی بخش ہے تو اس طرح کی اصلاحات کے لئے اس کے پاس بہت روپیہ ہے جو قوم علی گڑھ کالج بنا سکتی ہے درآں حالیکہ اس سے اس نے جتنی توقعات وابستہ کی تھیں، ان میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی، وہ ایک ایسے دار العلوم کی کفالت سے عاجز نہ رہے گی جو علوم جدیدہ کی تعلیم قرآن و حدیث کے ماتحت رکھ کر دے، ہمیں امید ہے کہ اب ہمارے علما اس کے لئے ہمت کریں گے ورنہ دنیا کی سیاست میں جدید تعلیم یافتوں کے مقابل میں ان کی حیثیت وہی ہوگی کہ ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است"۔ (۶۲)

عربی و دینی تعلیم کے مسئلے میں مسلمانوں کی بے اعتنائی پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں علوم دینیہ کی کس مپرسی کا جو عالم ہے وہ محتاج بیان نہیں، دوسروں کو تو اس کی فکر ہی کب تھی کہ ان سے کوئی شکایت ہو، البتہ ہمارے علما اس معاملہ پر کبھی کبھی غور کرتے تھے لیکن اب انہوں نے بھی اس کے مستقبل پر غور کرنا چھوڑ دیا حالانکہ اگر اس وقت یہ سب سے اہم مسئلہ نہیں تو

کم از کم ان مسائل میں تو ضرور ہے جن پر ہندوستان کے مسلمانوں کی آیندہ قسمت کا انحصار ہے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ کی تحصیل صرف غربا کرتے ہیں، امرا اور عام ارباب استطاعت کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور یہ غربا بھی عموماً محض اس وجہ سے اس میں سر کھپاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم گراں ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکتے، اگر آج اس راہ کی دشواریاں دور ہو جائیں یا کم ہو جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ بہت کم لوگ رہ جائیں گے جن کو عربی تعلیم سے دل چسپی باقی رہ جائے اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان دشواریوں کے دور ہونے میں بہت دیر لگے گی، پس جن لوگوں کو ہندوستان میں مذہبی تعلیم باقی رکھنی ہے ان کو چاہیے کہ وقت آنے سے پہلے اس معاملہ پر غور کر لیں۔

ہم کو اس سچائی سے انکار نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عربی مدارس کی تعلیم سے بھی زیادہ بے قیمت ہو گئی ہے، معمولی معمولی نوکریوں کے لئے ہزاروں گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ درخواستیں دیتے ہیں اور محروم رہتے ہیں اور اس محرومی نے بہت حد تک لوگوں کے حوصلے پست کر دیے ہیں، تاہم وہ اس محرومی کے اندر بھی ایک امید کی قوت محسوس کرتے ہیں، ان کو خیال ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ مسائل میں دوسروں کے مقابل میں زیادہ کامیاب حصہ لے سکتے ہیں اور اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی شان باقی رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارے عربی مدارس کے طلبہ کا عام طور پر یہ حال نہیں ہے، ان پر ایک مایوسی اور افسردگی طاری ہے، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اجنبیت اور بے گانگی محسوس کرتے ہیں اور خیال کر رہے ہیں کہ وہ جن حالات کے اندر ہیں، ان حالات کے مقابلے کے لیے ان کی تعلیم ان کو مسلح نہیں کر رہی ہے، اس چیز کی وجہ سے ان کی ناامیدیاں بڑھتی جاتی ہیں اور اگر مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقہ میں ضروری تبدیلیاں نہ کی

گئیں تو اس کے نتائج اب اچھے نہ ہوں گے۔

معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ہمارے ارباب حل وعقد وہ لوگ ہیں جو مذہبی تعلیم سے بالکل محروم ہیں، حالاں کہ یہ منصب اصلاً علما کا تھا مگر علما کی جماعت مختلف وجوہ سے اپنے اس منصب سے محروم ہو کر دوسروں کی پیروی پر مجبور ہو چکی ہے اور ہماری مذہبی تعلیم جس روش پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اب یہ حالت تبدیل نہ ہوگی، علما آہستہ آہستہ فکر وعمل کے تمام گوشوں سے نکلتے جائیں گے، یہاں تک کہ مذہب اور مذہبی تعلیم کو لوگ ایک غیر مفید چیز سمجھ کر بالکل چھوڑ دیں گے، حالات کی رفتار جو اب تک رہی ہے وہ بھی کچھ کم افسوس ناک نہ تھی لیکن اب نئی تبدیلیاں نہایت خطرناک ہیں، اب جو جماعت آگے آگے چلے گی اس کے ہاتھ میں ایک موثر طاقت ہوگی اور یہ طاقت برابر بڑھتی جائے گی، پس اگر ہم نے اپنے تمام امور اس جماعت کے ہاتھ میں دے دیے تو لامحالہ ہمیں اس بات پر راضی ہونا پڑے گا کہ ہمارے قومی ومذہبی معاملات کو جس رنگ میں یہ جماعت رنگ دے ہم اسی رنگ کو پسند کریں اور اگر ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں تو اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار ہونا چاہیے اور اس کی شکل صرف ایک ہی ہے کہ ہم مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلی کریں کہ اس سے ایسے علما تیار ہوں جو ہماری دینی ودنیاوی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی کر سکیں۔

یہ کام ہے نہایت مشکل، عربی درس گاہیں اس درجہ کس مپرسی کے عالم میں ہیں کہ کوئی موثر اور اہم تبدیلی کرنا ان کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے لیکن اب اس کام کو کیے بغیر چارہ نہیں، یا تو تبدیلی کیجیے یا علوم دینیہ کی رہی سہی یادگاروں کو آخری سانسیں گننے کے لئے تیار ہو جائیے"۔ (۹۳)

ایک جگہ مذہبی رہنماؤں اور علما کے اثر واقتدار سے پڑھے لکھے طبقہ کے آزاد ہو جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایسی حالت میں سب سے زیادہ اہم کام جو ہمارے علما کے کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی ضروریات کے لئے ایسے علما تیار کریں جو ہر مورچہ پر ان کی لڑائی لڑسکیں اور دین و دنیا کے تمام معاملات میں پوری طرح باخبر اور ہوشیار رہیں"۔(۶۴)

اس کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی مدارس کی ضرورت واہمیت کے پوری طرح معترف تھے، ان کے خیال میں اگر ہندوستان میں اسلامی کلچر اور اسلامی تہذیب کے کچھ باقیات صالحات آج موجود ہیں تو یقیناً وہ صرف علما اور عربی درس گاہوں کی بہ دولت موجود ہیں، اگر غدر کے بعد چند چھوٹے بڑے مدرسے نہ قائم ہو گئے ہوتے اور بعض علمائے حق (اللہ تعالیٰ ان کی قبریں ٹھنڈی رکھے) زمانہ کی ہر طرح کی نامساعدت کے باوجود جگہ جگہ پھوس کے جھونپڑے ڈال کر قال اللہ وقال الرسول میں مشغول نہ ہو جاتے تو آپ دیکھتے کہ ہمارا اسلامی کلچر کب کا.........مذبوح ہو چکا ہوتا.........مگر عربی مدارس کا احسان ہے کہ اسلامی کلچر یا کم از کم اس کے نام کی محبوبیت عوام کے دلوں میں باقی رہ گئی۔(۶۵)

دینی تعلیم اور عربی مدارس کے تعلق سے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی ان متفرق تحریروں سے ان کا نقطہ نظر بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے، آخر میں ان کا یہ خیال بھی ملاحظہ ہو کہ علمی کدوکاوش اور تحقیق وجستجو کا اصل مقصد کیا ہونا چاہیے؟ لکھتے ہیں:

"اگر ایک شخص پیٹ کی غلامی سے چھوٹا اور جا کر علم کی (بہ اصطلاح جدید) عبادت میں منہمک ہو گیا تو پہلے کی نسبت قابل تعریف ضرور ہے کہ اس کا زاویہ نگاہ وسیع ہو گیا لیکن درحقیقت وہ ایک زنجیر سے چھوٹ کر دوسرے دام میں شکار ہو گیا، پس موجودہ زمانے میں ہمارے تعلیم کے ناخداؤں کو یہ بات ضرور سامنے رکھنی چاہیے کہ ہماری قوم کے نوجوان اسلام کو بہ طور اصل مقصود کے پیش نظر رکھیں اور علم وتحقیق کی تمام وادیوں سے گھوم کر اسی کی طرف آئیں اور اپنی ساری جستجو وکاوش کا منتہا اسلام کو قرار دیں"۔(۶۶)

۵۔ الاصلاح کے زمانہ اشاعت میں مدرسہ کے جو طلبہ، اساتذہ، مجلس انتظامیہ کے

ارکان وہمدردان اور ضلع کے اعیان اور سرکردہ اشخاص فوت ہوئے، ان کا ہی اس کے شذرات میں ذکر نہیں ہے بلکہ ملک وملت کے جن ممتاز اصحاب علم وقلم، اردو کے برگزیدہ شعراو مصنفین، ادیبوں، ماہرین تعلیم، فضلائے وقت اور مشاہیر سیاست نے اس اثنا میں وفات پائی، ان کا بھی تذکرہ ہے اور اس میں مذہب وملت کی تفریق بھی نہیں کی گئی ہے، چنانچہ منشی پریم چند کا جب انتقال ہوا تو الاصلاح کے شذرات میں اس کا بھی ذکر ہوا اور تقریظ وتبصرہ کے کالم میں ان کے ناولوں پر تبصرے بھی ہوئے۔

لیکن الاصلاح کی اس طرح کی تحریریں بہت مختصر ہیں اور ان میں مرحومین کے حالات وواقعات زیر بحث نہیں آئے ہیں، تاہم جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ان کی سیرت وشخصیت کا اصل خط وخال اور نمایاں خصوصیات سامنے آجاتی ہیں لیکن بعض ماتمی تحریریں بہت طویل ہیں جیسے کمال اتاترک اور ڈاکٹر محمد اقبال پر بہت طویل مضمون ہے۔

الاصلاح میں متوفی حضرات کی تعداد زیادہ ہے، ہم صرف چند اصحاب کا ذکر کریں گے، سب سے پہلے الاصلاح میں "دو غم انگیز حادثے" کے عنوان سے جن دو اصحاب کا ذکر ہے ان میں اول الذکر مولانا شبلیؒ کے خاندانی اور موخر الذکر نانہالی عزیز تھے، ملاحظہ ہو:

شیخ سلطان احمد نعمانی یہ آنریبل جسٹس اقبال احمد صاحب نعمانی (جج ہائی کورٹ الہ آباد) کے چھوٹے بھائی تھے، ہماری ملاقات ان سے سرسری اور بالکل تازہ تھی لیکن مدرسہ کے ساتھ ان کی محبت اور ہمدردی دیرینہ تھی، ان سے جب جب ملنے کا اتفاق ہوا ان کے جوش اخلاص اور محبت نے گرویدہ کر لیا، آخری ملاقات شوال کے مہینہ[1] میں مرحوم کے وطن بندول میں ہوئی تھی جو چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی لیکن ان ہی چند لمحوں کے اندر ان کی خوش اخلاقی اور تواضع نے دل پر ان کی محبت کا ایک پائدار نقش قائم کر دیا، قومی اور تعلیمی معاملات سے ان کو خاص دلچسپی تھی، دائرۂ حمیدیہ اور الاصلاح کے منصوبہ کا انہوں نے جس جوش سے خیر مقدم کیا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مژدۂ جاں فزا کے لئے ایک عرصہ سے منتظر تھے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اعزہ ومتعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔(۶۷)

حاجی شیخ محمد انصاری یہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے برادر عم زاد تھے، علامہ

[1] یہ تحریر ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ میں لکھی گئی تھی۔

شبلی نعمانی مرحوم کے قائم کیے ہوئے انگریزی مدرسہ شبلی جارج ہائی اسکول (اعظم گڈھ) کی انہوں نے جس اخلاص وایثار کے ساتھ خدمت کی وہ قومی خادموں کے لئے ایک قابل تقلید مثال ہے، مدرسۃ الاصلاح کی تمام مجالس کے وہ رکن تھے، مدرسہ کے رشتۂ سیاست میں جب کبھی کوئی گرہ پڑی، اس کے کھولنے میں ان کے ناخن تدبیر نے ہمیشہ کارکنوں کی مدد کی، وہ نہایت وجیہ اور پرشکوہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متین اور سنجیدہ تھے، ان کا دماغ نہایت سلجھا ہوا تھا، سخت سے سخت اشتعال کے مواقع میں بھی وہ اپنے لب ولہجہ کی شرافت اور دماغ کا توازن قائم رکھنے کے عادی تھے، ان کا ارادہ اٹل تھا، ان کی جرأت وجاں بازی میں سپاہیوں کا جوش تھا، ان کی موت نے ایک نہایت قیمتی وجود سے ہم کو محروم کردیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو رضا بالقضا کی توفیق سے نوازے۔ (۶۸)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ڈاکٹر انصاری ہماری پہلی صف کے لیڈر تھے، ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے گونا گوں خوبیاں جمع کردی تھیں جو کسی ایک شخص میں مشکل ہی سے جمع ہوتی ہیں، قومی اور وطنی دونوں اعتبارات سے وہ ہماری گراں مایہ دولت تھے، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، سنجیدگی، اعلا قابلیت، ٹھوس خدمت بے مثال تھی، حب وطن کے مدعی ہندوستان میں بہت ہیں لیکن ڈاکٹر انصاری مرحوم جس مقام تک پہنچے تھے، ہندوستان کے ہندو اور مسلمان لیڈروں میں اس بلندی تک کتنے پہنچ سکے؟ وہ اپنی سیاسی زندگی میں آگے بھی چلے اور پیچھے بھی - اور آج ہر شخص اعتراف کرے گا کہ وہ ایک بہترین رہنما تھے، وہ پیچھے چلنے کے عادی تھے لیکن ضرورت کے وقت آگے چلنے سے کوئی چیز ان کو روک نہیں سکتی تھی، وہ ایک پرجوش انتہا پسند لیڈر تھے لیکن ہیجان واشتعال سے بالکل خالی - وہ قوم اور وطن دونوں کے فدائی تھے، ان کی دولت قومی دولت تھی، ان کا مکان قومی مہمان سرا تھا، ایسے زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کی قوم رجال پیدا کرنے کی صلاحیت یک قلم کھو چکی ہے ایسے عظیم الشان انسان سے ہمارا محروم ہو جانا کتنی بڑی بدبختی ہے۔ (۶۹)

اسی اشاعت میں علامہ محمد مارماڈیوک پکتھال اور عباس طیب جی کے حادثے کا ذکر بھی ہے لیکن دو دو سطروں میں۔

حافظ عبدالحئی صاحب اب مدرسہ کے ایک استاذ کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی کے تاثرات "طوبیٰ لمن مات ولسانہ رطب من ذکر اللہ" کے عنوان سے ملاحظہ ہو:

"ہمارے مدرسہ کے ایک بزرگ استاذ حافظ عبدالحئی صاحب تھے جو مدرسہ کے ابتدائے قیام سے مکتب میں بچوں کو قرآن مجید حفظ کراتے تھے، ۳۰؍جولائی کی شام کو انہوں نے انتقال فرمایا، عمر ۷۵-۸۰ کے لگ بھگ ہو چکی تھی مگر قوی اچھے تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔

حافظ صاحب مرحوم نہ علم کے مالک تھے نہ دولت کے مگر نیکی وتقویٰ کے تاج دار اور گنج قناعت کے بادشاہ تھے، اپنی سادہ زندگی کے لئے جو چھوٹے بڑے قاعدے ٹھہرا لئے تھے، ان پر سورج اور چاند کی سی باضابطگی کے ساتھ چلتے تھے، اپنے اوقات کے گھڑی کی سوئی کی طرح پابند تھے، وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک خود راقم سطور ان کے حالات کا شاہد عینی رہا ہے، ان کی جو ادائیں پہلے روز دیکھی تھیں وہ مرتے دم تک ان کے ساتھ رہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا میں بستے ہی نہیں جس میں رات اور دن بدلتے ہیں، موسمی تغیرات طاری ہوتے ہیں، افکار وخیالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور رنج وراحت اور نفرت ومحبت کی بہاریں اور خزائیں آتی ہیں، وہ ہمیشہ بہار کی طرح خنداں اور صبح کی طرح پرسکون، مصائب پر صابر اور نعائم پر شاکر، نہ زمانے سے شکوہ سنج نہ تقدیر سے گلہ مند، بالکل نفس مطمئنہ کی تصویر!! شوق اگر کسی چیز کا تو عبادت کا اور ولولہ کسی چیز کے لئے تو نماز کے لئے۔

یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ان کی بیماری کی خبر سنی ہو، بس یہ ایک خبر سننے میں آئی اور وہ بھی اس طرح کی اکثر نمازیں مسجد میں پڑھتے ہیں، ہر وقت خدا کی یاد میں رہتے ہیں، ملنے والوں سے ملتے ہیں اور موت کے استقبال کے لئے پوری طرح مطمئن ہیں، بس ان ہی تیاریوں میں جان جاں آفریں کو سونپی اور اس استقلال واطمینان کے ساتھ کہ شاید بڑے بڑے فلسفیوں اور حکیموں کے لئے

بھی ان کی آخری ساعت کا اطمینان قابل رشک تھا۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب مرحوم کے خلف الصدق جناب حافظ نصیر الحق صاحب[1] کو مرحوم باپ کی تمام خوبیوں کا وارث بنائے اور چلے جانے والے کی طرح رہ جانے والوں کا دل بھی اپنے ہی دامن رحمت سے وابستہ رکھے، دنیا اور دنیا والوں کے حوالہ نہ کرے"۔ (۷۰)

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی خدمت قوم کے ولولہ، زندگی کے مجاہدانہ انداز، دیکھنے میں علم و تحقیق کی دنیا کے آدمی نہ معلوم ہونے، طالب علموں کی طرح مطالعہ کے شائق، تاریخ سے خاص ذوق، قرآن مجید سے دل چسپی، مختلف عنوانات پر متعدد مفید و قابل مطالعہ کتابیں یادگار چھوڑنے وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"خاص بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی عملی خدمت کے لئے ہمیشہ سربکف رہتے تھے، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے زور کے زمانے میں ایک لٹھیا لے کر شب و روز دیہاتوں میں چکر لگاتے تھے اور مسلمانوں کے دین و ایمان کی پاسبانی کرتے تھے، خاکساری تکلف کی حد تک تھی، مہمان کے سامنے بچھ جاتے تھے اور خدمت و محبت کی کوئی بات اٹھا نہ رکھتے تھے، قلق ہے کہ ہماری قوم کا کیسا شریف اور کارکن خادم اٹھ گیا، اللہ مرحوم کو اعلاء علیین میں جگہ دے"۔ (۷۱)

شاہ غلام صابر بعض حضرات کا ذکر بڑے اختصار سے کیا ہے مگر ایجاز بھی تو جانِ بلاغت ہے مثلاً ضلع کے ایک بڑے سرگرم و متحرک شخص کے متعلق لکھا ہے:

"شاہ غلام صابر صاحب جو ہمارے ضلع کے ایک کامیاب مختار، مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامی کے ممبر اور ضلع کی مقامی سیاسیات کی رونق تھے، بہ عارضۂ دق انتقال کر گئے"۔ (۷۲)

اصغر گونڈوی اردو کے بہت مشہور و مقبول شاعر اصغر گونڈوی مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

[1] مدت ہوئی یہ بھی اللہ سے جا ملے۔

"اصغر صاحب اپنی بعض شاعرانہ خصوصیات کی وجہ سے ان شاعروں میں ہو گئے تھے جن کا کلام صدیوں زندہ رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور قوم میں ان کے صحیح قائم مقام پیدا ہوں"۔ (۷۳)

مولوی نور الحسن نیر و منشی پریم چند "دو ادیبوں کی موت" کے عنوان سے ایک شذرہ میں رقم طراز ہیں:

"اخبارات میں مولوی نور الحسن صاحب نیر صاحب نور اللغات اور مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی موت کی خبریں چھپی ہیں، مولوی نور الحسن صاحب مرحوم اردو زبان کے ماہر ادیب تھے، انہوں نے نور اللغات کی تالیف سے اردو زبان کی ایک پائدار خدمت انجام دی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

منشی پریم چند آں جہانی نے اپنے بے نظیر افسانوں کے ذریعہ اردو زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، اردو زبان میں صرف ان ہی کے افسانے پڑھے جانے کے لائق ہیں، ہر چند ہم ان کے جدید رجحانات سے متفق نہیں تھے لیکن ان کی قدیم خدمات کبھی فراموش نہیں کر سکتے"۔ (۷۴)

جی تو چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ اور دراز کیا جاتا کہ اسی بہانے "نام نیک رفتگاں" ضائع ہونے سے محفوظ رہتا مگر طوالت مانع ہے، اس لئے اب صرف علامہ اقبال کے طویل شذرہ کے جستہ جستہ اقتباسات نقل کر کے اسے ختم کرتے ہیں۔

ماتم اقبال "اونچے اشخاص ہم میں اولاً تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر دو چار پیدا ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ ان کے جانشین پیدا ہوں، وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر چل دیتے ہیں......... وہ عظیم الشان ہستی آج اٹھ گئی جو حوصلوں اور ولولوں کو دعوت رفعت و سبقت دینے کے لئے ایک نشان پرواز اور دماغوں کی رہنمائی و قیادت کے لئے پہاڑی کا چراغ تھی"......... وکٹر ہیوگو

نے کہا ہے" زندگی کتنی ہی شان دار اور عظیم الشان ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لیے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے" اقبال کے لئے تاریخ نے اپنے اس کلیہ کو توڑ دیا، اقبال کی عظمت کی گواہی دلوں نے ان کی زندگی میں دے دی، اب تاریخ کے لئے یہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ دلوں کے تاثرات کو محفوظ وقلم بند کرے .... جس شخص کی باتیں اہل مجلس کے لئے بیگانہ وناقابل فہم تھیں، اب اتنی مانوس ومحبوب ہوگئی ہیں کہ ہر بزم وانجمن کا افسانہ ہیں اور کوئی دل ایسا نہیں ہے جو اقبال کی عظمت کے آگے جھک نہ گیا ہو" .... اقبال نے جس جرأت کے ساتھ ہمارے علم وعمل کے ایک ایک گوشہ پر تنقید کی اور اپنی دیکھی ہوئی راہوں پر چل پڑنے کی دعوت دی، اس میں پیغمبرانہ عزیمت کی نمود ہے .... مولانا حالی کی زبان بھی تیغ وسنان سے کم نہ تھی، وقت کی سوسائٹی جن عناصر سے مرکب تھی ان میں سے ایک ایک کو چن کر حالی نے پکڑا اور قوم کی عدالت میں مجرم ٹھہرا کر ان کو بے دریغ سزا دی اور اپنی بے پناہ قوت سے ہمارے تمام اعمال و معتقدات کو ایک نئی راہ پر لگا دیا لیکن حالی کا کام آسان تھا، وہ قوم کو زمانہ کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی .... مگر اقبال اللہ اکبر اس کی سطوت وجلالت کا کون اندازہ کرسکتا ہے، وہ زمانہ سے جنگ کرنے کے لیے آیا تھا ع زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز، ان کو جو پیغام دینا تھا نہ صرف یہ کہ زمانہ اس سے آشنا نہیں رہ گیا تھا بلکہ وقت کی ذہنیت اس سے مختلف قالب پر ڈھل چکی تھی، کائنات کی تمام قوتیں ہم کو ایک نئی سمت میں کھینچ لیجانے کے لئے نہ صرف پوری طاقت ور ہوچکی تھیں بلکہ ہم نصف سے زیادہ منزل اس راہ کی طے کرچکے تھے مگر اقبال تسخیر قلوب وارواح کی ایک غیبی طاقت سے مسلح ہوکر آیا اور اس نے ہم کو ایک بڑے خطرے سے بچالیا، یہ خودی کا وہی احساس ہے جس کو اقبال نے پوری قوت سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی .... جو لوگ اس کے فلسفہ کا سراغ نطشے اور برگسان میں لگانا چاہتے ہیں، منفعل ومرعوب، ذہنیت اس بادۂ تند کو مشرق کے کسی میکدہ کی ہوسکنے کا تصور نہیں کرسکتی، حالانکہ اس کے خیالات کا اصلی مصدر قرآن ہے، اس نے قرآنی صداقتوں اور عربی حکمتوں کو زمانہ کا آب ورنگ دے کر خوش نما بنانے کا ننگ گوارا نہیں کیا، وہی پرانا کیسہ اور وہی بے ترشے ہوئے نگینے جب اقبال نے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پیش کیا تو نگاہیں خیرہ ہوگئیں .... اقبال نہ پیدا

ہوتے تو کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو مسخ کر ڈالتی، ان کے اندر دین و ملت کے لئے حمیت وغیرت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جاتا .... جب تک ان کی روح شعر اس کائنات کے اندر کارفرما ہے، اس وقت تک انشاء اللہ ان میں درد کی ایک کسک باقی رہے گی .... جب مایوسیاں گھیر لیتی تھیں، ہم اقبال کے شعروں میں ایک نشان امید دیکھتے تھے، جب تاریکیاں چھا لیتی تھیں، اقبال ہمارے لئے شعاع ہدایت بن کر چمکتے تھے، وہ روحوں کو گرما دیتے تھے، دلوں کو تڑپا دیتے تھے، ان کی زبان سے ہم مشرق کے ضمیر کی صدائیں سنتے تھے، ان کے ہندی نغموں میں حجاز کی لے مضطرب تھی، وہ زمین کے تھے مگر ان کی پرواز آسمان تک تھی، وہ شاعر تھے مگر ان کی شاعری میں علم نبوت کی روح کارفرما تھی، وہ دنیاداروں کے بھیس میں قلندر اور دیوانوں کے رنگ میں دانائے راز تھے، خداوندا ہمارا یہ شاعر کہاں گیا، اس کی روح پر تیری رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں"۔(۷۵)

۶-مدیر الاصلاح جس درجہ کے اہل قلم اور مصنف تھے، اسی درجہ کے مقرر اور خطیب بھی تھے، اس لئے مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات، علمی وتعلیمی جلسوں میں برابر مدعو کئے جاتے اور مدرسہ کی ضرورتوں سے ملک اور بیرون ملک کا سفر کرتے رہتے تھے، اس زمانے میں وہ جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم کو بھی پسند کرتے تھے، اس لئے اس کے اجلاس میں بھی تشریف لے جاتے، غرض جہاں جاتے وہاں کے سفر کی اہم اور دلچسپ باتوں، جلسوں کی روداد، علمی وتعلیمی اداروں کے حالات اور وہاں کے اہم اشخاص سے اپنی ملاقات اور ان سب کے تعلق سے اپنے تاثرات الاصلاح کے شذرات میں قلم بند کرکے اس کے قاریوں کے لئے بھی لطف وانبساط کا سامان کرتے۔

خدابخش لائبریری پٹنہ: مئی ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ علمائے بہار کا اجلاس دربھنگہ میں ہوا، اس میں وہ بھی شریک ہوئے اور جلسے کے علاوہ بعض علمی وتعلیمی اداروں میں بھی رونق افروز ہوئے اور ان کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کئے، مثلاً:

"پٹنہ میں کام دوسروں کا تھا مگر غرض اپنی تھی، اورینٹل لائبریری کی سیر کا شوق عرصہ سے تھا، اس دارالعجائب میں چند گھنٹے بسر ہوئے، محب مخلص

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی آج کل کیٹلاگ کی خدمت پر مامور ہیں، ان کی رہنمائی اور میزبانی سے بے تکلف متمتع ہوا جن چیزوں کو دیکھ کر خاص طور پر مسرت ہوئی ان میں سے ابوجعفر احمد بن زبیر اندلسی متوفی ۷۰۸ھ کی ایک کتاب "البرهان فی ترتیب سور القرآن" ہے، احمد بن زبیر مشہور نحوی اور مفسر ابوحیان کے شیخ ہیں، کتاب مختصر ہے، اس میں مصنف نے ہر سورہ کا اس کی سابق ولاحق سورتوں سے معنوی ربط وتعلق واضح کیا ہے اور اختصار کے ساتھ ہر سورہ کے مضامین میں بھی ربط دکھانے کی کوشش کی ہے، کتاب جستہ جستہ دیکھی، بعض باتیں نہایت عمدہ ملیں، پوری کتاب میں معلوم نہیں کیا کیا جواہر ہوں گے، ان کا طریقہ فکر وتدبر استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے طریقہ فکر وتدبر سے بہت اشبہ ہے، مجھ کو بعض مباحث میں دونوں کے نتائج تحقیق یکساں ملے، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اگر اس کتاب کو چھاپ دے تو قرآن کے طلبہ پر بڑا احسان ہو، پٹنہ میں ایک ہم وطن اور پرانے ہم مدرسہ بھائی اور دوست ریاض الحق صاحب ایم اے کی میزبانی اور عنایات بے پایاں کو بھی یاد رکھوں گا"۔(۷۶)

پھلواری شریف کی حاضری اور حضرت امیر شریعت سے ملاقات کی عزت: پٹنہ سے اپنے محب مخلص مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب کی معیت میں چند گھنٹے کے لئے پھلواری بھی تشریف لے گئے، رقم طراز ہیں:

"حضرت امیر شریعت مدظلہ[1] سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی، درویشانہ شفقت کے ساتھ مصافحہ ومعانقہ فرمایا، جس مکان میں باریاب فرمایا (اور جو غالباً مستقل نشست گاہ ہے) وقت کے تمام تکلفات وتصنعات سے بالکل پاک ایک گوشۂ فقر ودرویشی ہے، جانماز پر فروکش تھے اور سامنے کاغذات کا ڈھیر تھا، یہ کاغذات یقیناً وقت کے مسائل مہمہ سے متعلق رہے ہوں گے، یہ

[1] یہ امیر دوم مولانا محی الدین کا ذکر ہے۔

نقشہ دیکھ کر مرحوم اقبال کے چند شعر یاد آ گئے، آج کل فقر وتصوف "نفی محض" کا نام ہے جس سے میری طبیعت کو انس نہیں مگر یہاں کی شان دوسری ہے، پیشانی تابناک تھی اور الفاظ وفقرے سادہ پر اثر- وقت کے غوغائے عام میں صبر وتوکل اور استقامت وعزیمت کی نصیحت فرمائی اور یہ مختصر صحبت اچھے تاثرات کے ساتھ تمام ہوئی"۔(۷۷)

دفتر امارت شرعیہ: امیر شریعت سے شرف ملاقات حاصل کر کے امارت شرعیہ کے دفتر میں حاضر ہوئے، لکھتے ہیں:

"پہلے وہلہ میں دفتر کو دیکھ کر میرے دل پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، تنگ جگہ اور ہر گوشہ میں کاغذوں اور فائلوں کا انبار، خیال ہوا کہ مسلمانوں کے تمام کاموں پر افسردگی کی جو موت طاری ہے، وہی موت یہاں بھی مسلط ہے، حضرت مولانا سجاد صاحب جو اس قالب کی روح ہیں، موجود نہیں تھے مگر کارکنوں کی خواہش پر میں نے دفتر کو دیکھا، جوں جوں میں کاموں کو دیکھتا گیا، میری مایوسی امید سے بدلتی گئی اور جب دیکھ کر فارغ ہوا تو میرے استعجاب اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی، مسلمانوں کے اندر جماعتی کام کا سلیقہ یک قلم مٹ گیا ہے، ہر شخص صرف ایک زبان اعتراض ونکتہ چینی بن کے رہ گیا ہے، بالخصوص مولویوں کے کاموں کی تحقیر ومخالفت تو گویا فیشن میں داخل ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود امارت شرعیہ کے ہاتھوں آج جو کام انجام پارہے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز ہیں، مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کا اصلی نقشہ یہی ہے، اسی طرح کا نظام ہمارے تمام صوبوں میں باضابطہ اور مکمل شکل وصورت میں قائم ہو جائے تو ہمارے تمام روگوں کا یہ واحد علاج ہے، اس کی نگرانی میں مقدمات طے ہوتے ہیں، مذہبی مدارس قائم ہیں، بیواؤں، یتیموں، مسکینوں کو وظائف ملتے ہیں، مبلغین اسلام مامور ہیں جو دیہاتوں اور قصبوں میں تبلیغ کرتے ہیں، عشر وزکوۃ کی تحصیل کا انتظام ہے اور گو مسلمانوں کے تشتت اور تعطل وجمود کی وجہ سے یہ نظام

حاوی و ہمہ گیر نہیں ہو سکا ہے لیکن جتنا کچھ بھی ہے نہایت مرتب، نہایت صحیح اور نہایت قرینہ وسلیقہ کے ساتھ ہے، تمام حساب وکتاب جدید طریقہ پر ہے، ہر کام کے لئے الگ شعبے ہیں اور ان کے علاحدہ علاحدہ انچارج، میں نے مقدمات کی مسلیں، حساب کے رجسٹر، دوچر، مدارس، ملازمین اور طلبہ وغیرہ کے اعداد وشمار سب مانگے اور سب دیکھے، سب نہایت قرینہ کے ساتھ مرتب موجود ہے، امارت کے شعبہ قضا کے کاموں کو میں نے خاص دل چسپی سے دیکھا اور میرے لئے ناممکن تھا کہ اس شعبہ کے کاموں اور اس کی خوبیوں کا اعتراف نہ کروں۔

ایک چھوٹے سے جھونپڑے کے اندر اتنے مختلف النوع شعبوں کا اجتماع اور سب کا سلیقہ اور صفائی کے ساتھ مرتب رہنا نہایت تعجب انگیز تھا اور مجھے اس پر اسی سرزمین کے مشہور بزرگ مولانا شاہ سلیمان پھلواری کا ایک لطیفہ یاد آیا، انہوں نے اپنی کسی تقریر میں دارالعلوم ندوہ کے مختصر مکان کو (موجودہ عالی شان عمارت کو نہیں، سابق عمارت کو) پنساری کی ایک ایسی بوتل سے تشبیہ دیا تھا جس میں جملہ قسم کے عرق ایک ساتھ جمع ہیں، مرحوم شاہ صاحب کا یہ لطیفہ امارت شرعیہ کے دفتر پر پوری طرح صادق آتا ہے مگر ان ماہر عطاروں نے ان تمام شربتوں کو اس طرح ایک ہی بوتل کے اندر جمع کیا ہے کہ وہ ملنے کے باوجود الگ الگ ہیں، بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ"۔(۷۸)

مولانا سجاد نائب امیر شریعت: امارت کا یہ دفتر بہت سی خصوصیات میں مولانا سجاد صاحب کی صفات کا عکس ہے، وہ بھی ایک "سر مخفی" ہیں، پہلی نظر میں ان کو دیکھ کر طبیعت پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا، وہ غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتے ہیں اور جب سمجھ میں آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت ایک طاقت ور اور ایک موثر شخصیت ہے، وہ بولتے بہت کم ہیں اور لکھنے سے بھی کچھ ایسی دل چسپی نہیں مگر سوچتے ہر وقت ہیں اور جب نقشہ بنا لیتے ہیں تو اس کی تکمیل کے لئے جان لڑا دیتے ہیں، وہ فکر، عمل اور اخلاص تین عناصر کا مجموعہ ہیں، بعضوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ "ملا" بے جانے بوجھے، عربی کی چند کتابیں پڑھ کر سیاست میں کیوں دخل دیتا ہے؟

میں نے کہا خوب! "تم ریڈیو پر مس فلاں اور مسٹر فلاں کے گانے سن کر اور اسٹیٹسمین میں اسپورٹ، سینما، ریس کی خبریں پڑھ کر تو دنیا جہان کی سیاست کے ماہر ہو گئے مگر مولانا سجاد جن کا ناخن فکر رات دن مسلمانوں کی قومی مذہبی گتھیوں کو سلجھانے میں مشغول رہتا ہے جو ربع صدی سے مسلمانوں کی تمام سیاست کا عملی تجربہ رکھتے ہیں، جنہوں نے بڑے بڑے مدعیان سیاست کی ہمتیں بوڑھی کر دیں اور خود ہنوز نوجوانوں کے سے عزم کے ساتھ میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں، سیاست نہیں جانتے، یہ کتنی عجیب بات ہے"۔(۷۹)

بہر حال عملی کام کا نقشہ وہی ہے جو امارت شرعیہ کی شکل میں صوبہ بہار میں قائم ہے، مستقبل کے ہندوستان میں ہم کو کچھ کرنا ہے اس کا ایک ناتمام خاکہ یہاں موجود ہے، یہ بھر جائے اور باضابطہ شکل میں آجائے تو ہماری مذہبی اور کلچرل زندگی کی کوئی بات اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتی، ضرورت ہے کہ ہم زندگی کی راہ اختیار کریں اور جماعت اور نظام میں رہ کر جینے کا طریقہ سیکھیں، کل بننے والی عمارت کی داغ بیل آج پڑنی چاہیے، یہ ہمارے استحقاق کا ثبوت ہوگا، دنیا میں دعاوی اور مطالبات ہمیشہ ٹھکرا دئے جاتے ہیں مگر واقعات سے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی، تم جو کچھ بننا چاہتے ہو خود بنو، ساری دنیا اس سانچہ میں آپ سے آپ ڈھل جائے گی لیکن ایک عملی نقشہ قائم کئے بغیر اگر یوں ہی شور کرتے رہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ساری دنیا ہماری کوتاہ آستینی اور درازدستی پر ہنسے گی۔(۸۰)

سیرت کمیٹی لاہور: مدیر الاصلاح ۱۹۳۷ء میں سیرت کمیٹی لاہور کے جلسے میں تشریف لے گئے تو اس کی بعض اصلاحات کی تحسین اور بعض نامناسب باتوں پر گرفت کی، سیرت کے جلسوں میں غیر مسلموں کے شریک ہونے پر مسرت ظاہر کی، کمیٹی کے شائع کردہ رسالوں کے غیر مسلموں میں مفت تقسیم کئے جانے کو سراہا اور مفید بتایا مگر یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ان کی علمی اور مصنفانہ زبان سے عام لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے، تقریروں کا معیار بلند کرنے پر زور دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر تقریروں کی زبان آسان نہ ہوگی اور وہ سیرت کے متعلق مفید اور صحیح معلومات پر مشتمل نہ ہوں گی تو فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا، پھر مجالس کی آرائش اور شیرینی وغیرہ فضول خرچیوں کی اصلاح پر زور دیا اور پھول پتیوں اور مٹھائیوں پر روپے خرچ کرنے کو اسراف اور بدمذاقی بتایا، جھنڈا،

مبہمل قسم کی نظمیں گا گا کر پڑھنے اور جلوسوں پر بھی ناگواری ظاہر کرتے ہوئے یہ اصولی بات لکھی:

''دنیا چاہے کتنی ہی بگڑ جائے لیکن ہم کو حضرت سرور کائنات ﷺ کا اسوہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے، بغیر اس کے نہ ہم دنیا کے دلوں کو جیت سکتے ہیں، نہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو ان کی اصلی صورت میں پیش کر سکتے ہیں.........

ہم بزم کے تماشائیوں کا لحاظ غیر ضروری سمجھتے ہیں، دینی خادموں کو بالکل بے پروا اور نڈر رہنا چاہیے، ورنہ اسی قسم کی غفلتوں سے نہایت خوف ناک بدعتیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جن کی اصلاح بعد میں ناممکن ہو جاتی ہے، ٹھیک کہو اور ٹھیک چلو، اسی میں برکت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کی رفاقت کے لئے لوگوں کو آمادہ کر دے گا، یہ خیال کہ فلاں بات عام جذبات کے پاس ولحاظ کے لئے ضروری ہے بالکل لغو ہے، قرآن مجید نے اس باب میں ہماری پوری رہنمائی کر دی ہے اور اسی کی ہدایت۔ ہدایت ہے''۔(۸۱)

جزائر ہند میں قادیانی اور عیسائی سرگرمیاں: الاصلاح کے اجراء سے قبل ۱۹۲۶ء اور دوبارہ ۱۹۳۵ء میں مدرسۃ الاصلاح کی ضرورت سے مولانا امین احسن صاحب نے مشرقی جزائر ہند (ملایا، جاوا اور سماترا وغیرہ) کا سفر کیا تھا، الاصلاح کے ایک قاری نے اپنے مکتوب سے ان علاقوں میں قادیانیت اور عیسائیت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے اپنے گزشتہ اسفار کی روشنی میں الاصلاح کے شذرات میں وہاں کے مسلمانوں کی سادہ لوحی، نیک دلی، جہالت، بے خبری، افلاس، اقتصادی زبوں حالی اور ان کے وہمی اور زود اعتقاد ہونے، ان کی مقاومت کی صلاحیت کی بربادی اور عیسائیوں کے گود میں اپنے کو ڈال دینے کی مجبوریوں کا ذکر کیا اور قادیانیت کے فروغ کو روکنے کے لئے اس فتنہ کا سد باب کرنے والی تنظیموں کو متوجہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ عربی، انگریزی، ملائی اور جاوی زبانوں میں رسائل تیار کر کے ان جزائر میں تقسیم کئے جائیں۔(۸۲)

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی: ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی منائی گئی، اس میں مدیر الاصلاح کی بھی شرکت

ہوئی، انہوں نے اس کی رسمی ونمائشی کارروائیوں پر صدمہ ظاہر کیا مگر ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس تقریب میں جو خطبے پڑھے ان کی ستائش کی، اسی ضمن میں مذہبی پیشواؤں اور قومی رہنماؤں کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بے پروانہ ہونے کی تلقین کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''ہمارا اصلی ذہنی ودماغی مرکز وہی ہے کیوں کہ ہماری قوم کے اچھے دل ودماغ یا اچھی صلاحیت واستعداد رکھنے والے طلبہ بیشتر وہیں آتے ہیں، اس اعتبار سے علی گڑھ کی برائی اور اچھائی ہماری قوم پر موثر ہے، اگر علی گڑھ غلط راہ پر چلے گا تو قوم کے بڑے حصے کو گم راہ کر ڈالے گا اور اگر صحیح راہ پر چلے گا تو پوری قوم کی ذہنیت میں ایک مفید تبدیلی پیدا کر دے گا، وہ ایک نہایت موثر وجود ہے......... پس وقت کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ علی گڑھ کو صحیح راہ پر لایا جائے، اس کے لئے نہایت وسیع پیمانے پر جدوجہد کی ضرورت ہے''۔(۸۳)

آگے لکھا ہے کہ طلبہ سے ہم کو زیادہ مایوسی نہیں ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی: علی گڑھ کے بعد وہ دہلی پہنچے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے ان کو پہلے سے غائبانہ محبت تھی اور دیکھنے کے بعد اس محبت میں کمی نہیں آئی، وہاں کے اکثر استادوں سے ملنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ کی طرح سب دیکھنے میں طالب علم اور غریب معلوم ہوتے ہیں، زیادہ تر نوجوانوں کی حکومت ہے، اس علمی خاندان کے شیرازہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی شخصیت نہایت محبوب اور موثر ہے، ان کے ایثار اور قابلیت کا ہر شخص معترف ہے، جامعہ کے طلبہ واساتذہ سب کو ان کا گرویدہ پایا، وہاں کی اندر کی فضا میں تکدر، اختلاف، تنافس کی بو نہیں محسوس ہوئی اور اس عہد تشتت واختلاف میں اللہ تعالیٰ کی یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو کسی جماعت کو مل سکتی ہے''۔(۸۴)

طلبہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''جامعہ کے طلبہ پر علمی اور قومی رنگ غالب ہے اور وہ اپنا وقت مفید

کاموں میں صرف کرتے ہیں، ہم کو جامعہ میں کوئی طالب علم ایسا نظر نہیں آیا جو جامعہ کے مخصوص ماحول سے متاثر نہ ہو، نمائش وتکلف اور چھچھوراپن ان میں بالکل نہیں ہے .... ہم کو پورا اطمینان ہے کہ جامعہ ہمارے لئے قومی نقطۂ نظر سے اچھی درس گاہ ہے .... بچوں کی تعلیم وتربیت کے باب میں جامعہ پر لوگوں کو اطمینان کرنا چاہیے''۔(۸۵)

آگے وہ ارباب جامعہ کو ایک زریں مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جامعہ میں مذہبیت، قومیت، ملیت، وطنیت ہر چیز نظر آتی ہے لیکن سرسری طور پر دیکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس کی ترکیب میں خلط غالب کیا ہے، اس لئے یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہے کہ جامعہ کا اصلی مزاج کیا ہے .... اس وقت مسلمانوں کو خدمت دین کے لئے نہایت پرجوش اور قابل خادموں کی ضرورت ہے، بس یہ چیز پیش نظر رکھ کر جامعہ کو اپنا سانچہ تیار کرنا چاہیے، جامعہ کے سامنے دو نہایت عمدہ نمونے بھی ہیں، مولانا محمود حسن اور مولانا محمد علی مذہب کے دیوانے لیکن ہوشیار اور کارداں، جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے رفقا ہم غریب مسلمانوں کا اگر یہ کام کردیں تو یہ سب سے بڑی خدمت ہوگی جو وہ اسلام کی کریں گے اور مسلمان ان کے شکرگزار ہوں یا نہ ہوں لیکن اللہ تعالیٰ ان کی صحیح خدمت کا ضرور صلہ عطا فرمائے گا''۔(۸۶)

مولانا نے ان دونوں بڑے قومی وملی اداروں کو جو زریں مشورے دئے تھے وہ آج بھی بامعنی ہیں۔

۷- الاصلاح کے شذرات میں اس وقت کے وقتیاور ہنگامی مسائل کا ذکر بھی ہے۔

مولانا شبلیؒ وفراہیؒ کی تکفیر: الاصلاح کی اشاعت کے پہلے ہی سال میں علامہ شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تکفیر کی گئی جس کی زد سے مدرستہ الاصلاح، الاصلاح اور ان کے ہمدرد و معاونین یہاں تک کہ اس زمانے کے دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنی

کوئی بھی محفوظ نہیں رہے، ظاہر ہے اس کا ذکر الاصلاح میں آنا لابد تھا، اس کی کئی اشاعتوں کے متعدد صفحات میں فتنۂ تکفیر پر مضامین شائع ہوتے رہے جن میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون ''علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین کے خلاف غوغائے تکفیر'' بھی تھا، مدیر الاصلاح نے بھی کئی مہینوں تک شذرات میں اس کا ذکر کیا، جولائی ۱۹۳۶ء کے مکمل شذرات اسی پر ہیں، الاصلاح کا تذکرہ اس کے بغیر ادھورا رہے گا، اس لئے اس کے کچھ اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

مضمون کی ابتدا غالب کے اس مشہور شعر سے کی گئی ہے جس سے اس کے تیور کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے ... غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مضمون کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''الاصلاح کے ناظرین یہ سن کر ہنسیں گے کہ بعض مولویوں نے حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی (برد اللہ مضجعہما وجعل الجنۃ مثواہما) کی تکفیر کا فتوی شائع کیا ہے اور اسی لپیٹ میں مدرستہ الاصلاح کے اساتذہ، طلبہ، کارکنوں اور ہم دردوں سب کو کافر بنا ڈالا ہے، اس زمانہ میں کفر کے فتووں کی وبا پھوٹ پڑی ہے، اس لئے یہ چیز چنداں لائق اعتنا نہ تھی، بالخصوص الاصلاح کے صفحات میں تو اس کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا لیکن چوں کہ ہمارے مخالفوں کے اس سب سے قیمتی تیر کا اصلی ہدف مدرستہ الاصلاح کے بعد غریب الاصلاح ہی ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ اس واقعہ کی یادگار میں چند حرف لکھ دیے جائیں کہ الاصلاح کی تاریخ ہمارے مفتیوں کے اس عظیم الشان کارنامے سے بے خبر نہ رہے۔

اس سلسلہ میں مولانا شبلی، مولانا حمید الدین، مولانا حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) متعلقین مدرستہ الاصلاح، اڈیٹر الاصلاح کو جو گالیاں دی گئی ہیں، ہم ان سے کوئی تعرض نہ کریں گے، مولانا شبلیؒ و مولانا حمید الدینؒ دنیائے دنی کی ان آلودگیوں کو چھوڑ کر کب کے جوار رحمت الٰہی

میں پہنچ چکے، اب اگر کوئی جماعت ان کو گالیاں دے کر خوش ہونا چاہتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ وہ دین و مذہب کا کوئی بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے تو ہم کو اس کی خوشی میں خلل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں ہے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ موجود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی خدمت کے لئے مدت دراز تک زندہ رکھے، ان کی نسبت ہم کو پورا اطمینان ہے کہ اپنے ہم قوموں کی نادانیوں کو معاف کردینے کے لئے ان کا دل پوری طرح فیاض ہے، علی ہذا القیاس مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور کارکنوں اور اڈیٹر الاصلاح کو بھی اس کا کوئی خاص ملال نہیں ہے، اگر ان علمانے عالم گیریہ اور تتار خانیہ میں اس کے جواز کا کوئی جزئیہ ڈھونڈ نکالا ہے تو ان کی زبانوں کو کون پکڑ سکتا ہے"۔(۸۷)

اس کے بعد جن عبارتوں کی بنا پر تکفیر کی گئی ہے اور ۳۲ صفحوں کے فتوے میں جو وجوہ تکفیر بیان کیے گئے ہیں ان کی حقیقت آشکارا کی ہے، دراصل فتوی کی کوئی حقیقت اور بنیاد نہ تھی مگر یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا، اس اداریے کی خاص چیز اڈیٹر کا زور قلم اور انشا پردازی ہے، لکھتے ہیں:

"اس سوال کا جو جواب فتوی میں دیا گیا ہے، اس کو پڑھ کر ہم کو بھیڑیے اور میمنے کی وہ حکایت یاد آگئی جو بچپن میں مکتب کی کتابوں میں پڑھی تھی، اس وقت بچپنے کے تقاضا سے بھیڑیے کی عجیب و غریب منطق سن کر ہنسی آئی تھی کسے خبر تھی کہ اسی بے پناہ منطق کی شمشیر براں ایک دن اپنی گردن پر بھی چلنے والی ہے ورنہ یقیناً غریب میمنے پر ترس آتا"۔(۸۸)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"جی چاہتا ہے کہ کچھ پوچھیں لیکن کس سے پوچھیں؟ مستفتی چند دیہاتی گنوار ہیں جو مولانا شبلی نعمانیؒ اور علامہ فراہیؒ کی تحریریں پڑھانے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکتے اور مفتیوں سے کچھ پوچھیں تو وہ یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیں گے کہ ہم مہر تکفیر کے سلطان ہیں، بحث و تحقیق کے ٹھیکہ دار نہیں لیکن خدارا الاصلاح بابت جون کے دونوں مضامین ملاحظہ فرمانے کے بعد وہ اتنا ضرور بتادیں کہ

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تکفیر کے بعد ابن عباسؓ، امام بخاریؒ، ابن حجرؒ، زرکشیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کے بارے میں ان کا کیا فتوی ہے"۔(۸۹)

علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں: ابھی فتنۂ تکفیر فرو نہیں ہوا تھا کہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" کے نام سے ۷۵ صفحات کا مولانا امداد صابری کا ایک رسالہ شائع ہوا تو الاصلاح نے اسکا بھی نوٹس لیا اور ۴-۵ صفحوں میں اس کا جواب تو نہیں دیا لیکن اس طرح کی تحریریں لکھنے والوں سے کچھ اصولی اور بنیادی باتیں ضرور کہی ہیں اور سید صاحب کو مبارک باد دی ہے کہ وہ ہندوستان میں اس وقت سب سے بڑے مصنف ہیں، ان کے قلم نے ہزاروں صفحات لکھے لیکن احتساب کے ایک پورے کمیشن نے سر جوڑ کے محنت کی اور ان کے ہزاروں صفحات میں اتنی ہی قرآنی مسامحات نظر آئیں تو سید صاحب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ وہ بہت سستے چھوٹے.........ایک غیر معصوم انسان کے لئے یہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اس سے چند مسامحات ہوگئیں، تعجب اور تحدیث نعمت کی چیز تو یہ ہے کہ چند ہی مسامحات ہوئیں زیادہ نہ ہوئیں۔(۹۰)

برما میں مسلمانوں کا بے دردانہ قتل عام: ہندوستان میں بھی اس زمانے میں فسادات ہوتے تھے جو آزادی کے بعد کے بہیمانہ فسادات کی طرح کے تو نہیں تھے تاہم ان کا ذکر بھی الاصلاح میں ہوتا تھا، برما بھی ہندوستان ہی کا حصہ تھا مگر الاصلاح کے زمانۂ اشاعت سے پہلے ہی وہ ایک علاحدہ ملک ہو چکا تھا، وہاں ایک بڑا بھیانک فساد ہوا اور اس میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا نہایت بے دردانہ قتل ہوا، اس خوں چکاں حادثے پر مدیر الاصلاح تڑپ اٹھے اور ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو نکل پڑے، لکھتے ہیں:

"اس ہنگامۂ خونیں کے بعض مناظر کی تصویریں ایک دردمند مسلمان نے چھاپ کر شائع کردی ہیں، اس کا ایک صفحہ ہمارے سامنے ہے، ان مناظر کو دیکھ کر کلیجہ شق ہوتا ہے، جلائی ہوئی مسجدوں اور مدرسوں کے سیاہ پوش نشانات، قرآن مجید کے پراگندہ اوراق کے انبار، مساجد کے صحنوں میں اماموں کے کٹے ہوئے سر اور پارہ پارہ جسم، محرابوں اور دیواروں پر ان کے مقدس خونوں

کے ڈھیر، چھ چھ مہینے کے معصوم بچوں کی دو نیم لاشیں، بوڑھوں، نوجوانوں، عورتوں، مسلمانوں، ہندوؤں کے بکھرے ہوئے اعضا! اللہ اکبر کس کا دل ہے جو ان ہولناک مناظر کو دیکھ کر پھٹ نہ جائے گا۔

اور یہ سب کچھ برما کے جنگلوں کے درندوں نے نہیں، وہاں کے شہروں اور قصبوں کے انسانوں نے کیا ہے، غدر اور طوائف الملوکی کے زمانے میں نہیں، ایک مہذب اور آئینی گورنمنٹ کی موجودگی میں کیا ہے، کرۂ ارض کے کسی مجہول اور بعید گوشہ میں نہیں، ایک ایسے ملک میں کیا ہے جو ابھی کل تک اسی ہندوستان کا ایک جز تھا اور آج بھی اسی شاہنشاہی کے ماتحت ہے، جس کے خاتم سلطنت کا ہندوستان نگیں ہے اور کسی دو ایک شہر میں نہیں کیا ہے کہ اس کو عارضی ہیجان و بحران کا نتیجہ سمجھا جائے، پورے ملک کے طول و عرض میں شہر شہر میں قصبہ قصبہ میں، گاؤں گاؤں میں کیا ہے، پھر دو ایک دنوں میں یہ سب کچھ نہیں کر ڈالا ہے کہ حکومت کی پولیس سوتی رہی ہو اور چپ چپاتے یہ سب کچھ ہو گیا ہو اور ان قلعوں تک آہوں اور فریادوں کی چیخیں نہ پہنچی ہوں، جہاں امن کا دیوتا سنگینوں، ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کے حصار میں اسی انتظار میں اضطراب کی گھڑیں اور بے چینی کی شامیں گزارتا ہے کہ کوئی پکارے تو وہ جواب دے اور کوئی چیخے تو وہ فریاد رسی کرے اور جس کا سب سے بڑا مقصد اقلیتوں کی جان و مال کی حفاظت ہے''۔

آگے لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہندوستانیوں کے ساتھ ہندوستانی ہونے کے جرم میں کیا گیا، ۵۰۰ ہندوستانی قتل ہوئے، ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے، دو ہزار دوکانیں لوٹ لی گئیں اور کم سے کم ایک کرور روپے کا مالی نقصان ہوا اور ہزاروں ہندوستانی بھاگ آئے، یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اور ان ہندوستانیوں کے اندر ظلم و ستم کے اصلی ہدف مسلمان تھے، ۹۵ فیصدی جانی و مالی نقصان ان ہی کا ہوا ہے اور اصل یہ ہے کہ وہاں ہندوستانی

مسلمانوں کو کاروبار میں جو حیثیت حاصل تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی، اس لئے قدرتی طور پر اصلی نشانہ وہی ہوئے اور افسوس ہے کہ بری طرح برباد کر دیئے گئے اور گو اب قیام امن کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا گیا ہے لیکن یہ آرڈیننس بھی برما سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے اخراج کا ایک پنج سالہ پروگرام ہے''۔(۹۱)

آفات ارضی و سماوی: الاصلاح کے شذرات میں کہیں کہیں آفات ارضی و سماوی کا تذکرہ بھی ہے، مثلاً مارچ ۱۹۳۷ء میں اعظم گڈھ میں سخت ژالہ باری ہوئی اور بڑی تباہی آئی تو اس کا ذکر کر کے اس سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اس طرح کے بعض اور واقعے بھی عبرت و تذکر کے لئے درج ہیں۔

۸۔ بعض مسائل وقتی اور ہنگامی ہونے کے باوجود آج تک دردسر بنے ہوئے ہیں اور خدا جانے ان کا کب تصفیہ ہوگا، اس نوعیت کے مسائل میں عالم اسلام کے مسائل بھی ہیں اور ہندوستان کے بھی، پہلے ہم عالم اسلام کی طرف چلتے ہیں۔

فلسطین: فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کی حکومت کا وجود تو ۱۹۴۸ء میں عمل آیا لیکن اس کے لئے تگ و دو اور جال بننے کا کام بیسویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہو گیا تھا، الاصلاح کے زمانۂ اشاعت میں ترکی کی طرح فلسطین بھی چنگیزی افرنگ کا نشانہ بنا ہوا تھا، قدرتی طور پر ناظرین اس کے متعلق مدیر الاصلاح کے خیالات جاننے کے متمنی ہوں گے، شذرات کے علاوہ الاصلاح کی تلخیص کے کالم میں بھی اس پر مضامین نکلے ہیں، ہم شذرات سے اس کے متعلق ان کی تڑپ اور بے چینی ظاہر کرنے والی بعض تحریریں یہاں نقل کرتے ہیں:

''فلسطین کے متعلق آج کل جو خبریں اخبارات میں آرہی ہیں، ان کو پڑھ کر مسلمانوں کی بے کسی پر کون دل ہے جو تڑپ نہ جاتا ہوگا لیکن فلسطین سے زیادہ ہماری ابتری اور پراگندگی کا معاملہ درد انگیز ہے۔

ہندوستان میں رہ کر ہم کر ہی کیا سکتے تھے، لے دے کے سارا زور صدائے احتجاج کے جلسوں اور تجویزیں پاس کر دینے والی کانفرنسوں تک محدود تھا مگر اولاً تو ہمتوں پر موت طاری ہے، ثانیاً اگر شاذ و نادر میں بعض لوگ کچھ

نمائش کرنا بھی چاہتے ہیں تو اعتراض کا شیطان بیچ میں کود پڑتا ہے اور نمائش کا رہا سہا ڈھونگ بھی بگڑ جاتا ہے، ایک جماعت اگر اعلان کرتی ہے کہ فلاں تاریخ کو جلسے کئے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی جائے، دعائیں کی جائیں تو دوسری جماعت اٹھ کر اس پر خط تنسیخ پھیر دیتی ہے اور ایک دوسری تاریخ اور ایک نئے پروگرام کا اعلان شائع کر دیتی ہے، ایک جماعت کسی شہر میں ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس کا اعلان کرتی ہے تو دوسری جماعت کسی اور شہر میں پانچ کر دس دن پہلے ہی ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس رچا لیتی ہے، یہ قوم ہے جو قرآن پر ایمان رکھتی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں شامل ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ "۔(۹۲)

وہ اس پر سخت افسوس کرتے ہیں کہ یہ صورت اس زمانے کی ہے جب گلی گلی میں تنظیم کے ہنگاموں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور مصائب و شدائد کے احساس نے دنیا کی نالائق سے نالائق قوموں میں بھی یگانگت اور یک جہتی کا احساس پیدا کر دیا اور بنیان مرصوص سے زیادہ محکم اور ٹھوس بنا دیا، ابھی تک مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی مثال یہود کو یاد کر کے یہ دیتے تھے کہ مسلمان اس طرح تباہ و برباد ہو گئے ہیں جس طرح یہود۔ لیکن اب اپنی نالائقیوں کی کوئی مثال دنیا کے کس گوشہ میں جا کر تلاش کریں، یہود مغضوب وملعون تھے، ان کی مقدس زمین ان کی نااہلیت کی وجہ سے معراج کی شب میں ہمارے سپرد کی گئی اب وہ ایک زندہ اور طاقت ور قوم بن گئی اور اپنی جگہ ہمارے لئے خالی کر دی، مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں " دنیا کی تاریخ کا یہ عبرت انگیز تماشا ہمارے حصہ میں آیا ہے کہ جو چیز ہم نے خدا کے ہاتھوں سے پائی تھی، برطانوی اقتدار کا ہاتھ اٹھا ہے کہ اس کو ہم سے چھین کر یہودیوں کے ہاتھ میں دے دے اور ہمارے رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ

خانہ شرع خراب است وارباب صلاح　　　در عمارت گری گنبد دستار خوداند

مدیر الاصلاح بہت جھنجھلا کر لکھتے ہیں کہ کانگریس کفار کی جماعت ہے، اس میں مت شریک ہوجیے، وہ وطن کو معبود بنا کر مسلمانوں کے عالمگیر نصب العین کو چھین لینا چاہتی ہے،

مسلمانوں کو صرف اپنے دین کی خدمت کرنی چاہیے اور اللہ کے لئے سر بکف ہونا چاہیے، وہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اللہ کا معاملہ نہیں ہے؟ کیا فلسطین کی سرزمین ہمارا دینی مرکز نہیں ہے؟ کیا اس کی مقدس مسجد ہمارا قبلہ اولیٰ نہیں ہے؟ کیا وہ ان تین مساجد میں سے ایک نہیں ہے جن کے لئے ہم شد رحال کر سکتے ہیں اور پھر کیا وہ حرم نہیں ہے جس کی حرمت کی حفاظت و صیانت سے بے پروا ہو کر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے؟ کیا فاروق اعظمؓ کے کارنامے ہم کو فراموش ہو گئے؟ کیا صلاح الدین کی تلوار اس سرزمین کی حفاظت کے لئے نہیں چمکی اور کیا یہ جھوٹ ہے کہ اس مجاہد اعظم اور محافظ ناموس و حرمت اسلام نے عین اس مقدس رات میں اس گھر کو نصاریٰ کے ہاتھوں سے چھینا جس مقدس رات میں اس گھر کی حفاظت و تولیت کی عظیم الشان امانت سرور کونین کو تفویض ہوئی؟ کیا ہماری تاریخ اور روایات کے یہ تمام اوراق پارہ پارہ ہو گئے"، پھر پوچھتے ہیں دین و مذہب کی تنہا پاسبان مسلم لیگ کہاں ہے، آخر وہ اسلام کی حفاظت کے لئے کیوں نہیں اٹھتی، جینا کہاں ہیں، جنھوں نے شملہ میں اعلان کیا کہ اسلام کی حرمت کے لئے توپوں کے دہانوں سے بھی نہیں ڈریں گے، اس معاملہ میں وہ جمعیۃ علمائے ہند کی بھی نہایت افسوس ناک غفلت بتاتے ہیں جس کے کرنے کا یہ کام تھا، دہلی کی فلسطین کانفرنس میں مسلمانوں کے لئے کوئی عملی پروگرام نہیں رکھا، جو تجویزیں پاس بھی ہوئیں ان کے لئے ایک دن بھی عملی کام نہیں ہوا، الہ آباد کانفرنس نے صرف صدائے احتجاج کا رزولیشن پاس کیا اور عملی تجاویز کو مستقبل مجہول میں ہونے والی کانفرنس کے لئے اٹھا رکھا، صدائے احتجاج کے لئے ملک میں کوئی باقاعدہ اور موثر پروپگنڈا نہیں کیا گیا، اس سے مدیر الاصلاح نے نتیجہ نکالا ہے کہ قوم کے دل و دماغ دونوں مردہ ہو گئے ہیں، ہم کو ملی مصائب کا اولاً تو احساس نہیں اور اگر ہے تو دماغ اس کے تدارک کی عملی تجاویز سے عاجز و مفلوج ہے، لکھتے ہیں " فلسطین کے حالات اول روز سے ایک ہی رخ پر ہیں اور جو لوگ تھوڑی بہت بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، وہ جانتے تھے کہ رائل کمیشن کس نتیجہ تک پہنچنے والا ہے لیکن ہمارے ارباب سیاست نے جو صرف حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں رہتے ہیں جوں ہی سن پایا کہ ایک کمیشن معاملات کی تحقیق کر رہا ہے، مطمئن ہو بیٹھے کہ اب آسمان سے خدا کی عدالت اتر آئی اور وہ ضرور مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہی کرے گی، نتیجہ یہ ہوا کہ

ہندوستان کے مسلمان بالکل ہی بھول گئے کہ دنیا میں فلسطین نامی کوئی سرزمین بھی ہے اور اس کے لئے انہیں کچھ کرنا بھی ہے، یہاں تک کہ موجودہ حالات پیش آگئے"۔

اس کے بعد وہ وزارت کے قلم دانوں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر متمکن لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جن کے گورنروں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ فلسطین تمہارے حدود انتظام کے اندر شامل نہیں ہے، ان سے سوال کرتے ہیں کہ خدانخواستہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر کوئی قوم گولہ باری کرے اور وہاں کے علما و مشائخ کو سسلی اور مالٹا کے جزیروں میں بند کردے اور تمہارے صدائے احتجاج کی اجازت پر کہے کہ حجاز تمہارے حدود انتظام میں داخل نہیں تو کیا کروگے، کیا چپ چاپ بیٹھے رہوگے، اگر نہیں تو وہ راہ عمل بتاؤ جو اس وقت اختیار کروگے، پھر آج وہ راہ عمل کیوں بند ہے، کیا قبلہ اولی کی حرمت اتنی بھی نہیں جتنی ان نام نہاد اسمبلیوں کی کرسیوں کی اور آخر میں اس قانون الٰہی کا ذکر کرتے ہیں۔

خدا جو کچھ ہمیں دے گا ہمارے عزم و حوصلہ کے پیمانہ سے ناپ کردے گا، جب تم خدا کے کلمہ کے اعلا کے لئے ہفت اقلیم کی بادشاہت کو بھی بال مگس کے برابر سمجھتے تھے، اس وقت تمہارا رتبہ یہ ہوا کہ تمہارے ہاتھوں سے خدا نے اونٹوں کی مہار لی اور سارے عالم کی سیادت کی زمام دے دی اور اب کہ تمہیں غلام ہندوستان کی کرسیاں تمہارے قبلہ اولی کی حفاظت و صیانت سے زیادہ عزیز ہوگئی ہیں، ایک دن آئے گا کہ تم اپنی بدبختی پر سر پیٹو گے اور کوئی نہ ہوگا جو تمہاری حالت پر دو آنسو بہادے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا (۹۳)

مسئلہ زبان: اب ہم ہندوستان کے ایک عقدہ لاینحل کے متعلق مدیر الاصلاح کے تاثرات قلم بند کریں گے جو زبان سے متعلق ہے، آزادی سے قبل ہی ہندی - اردو - اتھوا ہندوستانی کی بحث شروع ہوگئی تھی، الاصلاح کے مختلف شذروں میں اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطالعہ آج بھی دل چسپی سے خالی نہیں، اگرچہ اس میں ظاہر کیے گئے بعض خیالات سے ان سطور کے راقم کو اتفاق نہیں ہے پھر ان میں جو توقعات ظاہر کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں جس کے وجوہ بھی اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

اردو اور ہندی کا جھگڑا: مدیر الاصلاح نے سب سے پہلے جون ۱۹۳۶ء کے شذرات میں "اردو اور ہندی کا جھگڑا" کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا:

"ہندوستان کی مشترک زبان کے سلسلے میں اردو اور ہندی کا جھگڑا ایک عرصہ سے چل رہا تھا اور جیسا کہ توقع تھی، فریقین کے خیالات و مطالبات جس قدر کھلتے جاتے ہیں، بحث کی ناگواری اور تلخی اور پھر اتفاق رائے کی طرف سے مایوسی اسی قدر بڑھتی جاتی ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ شاید یہ فتنہ پچھلے تمام فتنوں سے بڑھ جائے اور میل ملاپ کی امیدیں جو آج بھی ایک خواب خوش سے زیادہ نہیں ہیں، ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیں، بلاشبہ ایک مشترکہ زبان کا تخیل نہایت اعلا تخیل ہے، آزاد ہندوستان کے لئے یہ ایک ایسی ضروری چیز ہے کہ اس کے بغیر آزادی کے صحیح نصب العین تک پہنچنا ناممکن ہوگا لیکن موجودہ حالات میں توقع نہیں کہ فریقین میں کوئی سمجھوتا ہوسکے، مسلمان اردو نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہندو ہندی سے دست بردار ہوسکتے، یہ برزخی زبان جس کو ہندوستانی کا لقب دیا گیا ہے، محض ایک بے معنی لفظ ہے، مسلمان اپنی فیاضی کی وجہ سے ممکن ہے کچھ اس کے قریب آجائیں لیکن ہندو اس سے کھنچتے جارہے ہیں، ہندوستانی کے متعلق فریقین کے نقطہ ہائے نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ اولاً تو اتفاق رائے ناممکن - ثانیاً اگر کوئی صورت اتفاق پیدا ہوئی تو وہ ایک ایسی زبان ہوگی جس کے لئے اردو یا ہندی کو چھوڑنا دونوں کا خون کرنا ہوگا، اصل یہ ہے کہ ابھی ہمارے بہت سے اختلافی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی قبل از وقت چھڑ گیا ہے اردو کے حامیوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ زبان زیادہ سے زیادہ ستھری اور نظیف ہوجائے باقی رہا یہ کہ ہماری مشترکہ زبان کیا ہوگی، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا اور یقیناً زمانہ اردو کے قدرتی حقوق ترجیح کو نظر انداز نہیں کرسکتا"۔ (۹۴)

مشترکہ زبان کے تخیل کو اعلا قرار دینا نظری حیثیت سے تو ٹھیک ہے لیکن یہ عملاً ان ملکوں

میں بہت مشکل ہے جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، اسی لئے یورپ کے بھی کئی ملکوں میں جہاں کئی زبانیں رائج ہیں، ملک کی سرکاری زبان ایک نہیں ہے، ہندوستان کی بڑی زبانیں دو تھیں، اردو اور ہندی جو چند جگہوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھیں لیکن اردو کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ لسانی جارحیت وتعصب کی بہت بھونڈی مثال ہے، مولانا کا یہ خیال صحیح نہیں تھا کہ یہ مسئلہ قبل از وقت چھیڑ دیا گیا، اس وقت کئی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بن گئی تھیں اور اس وقت اس کا فیصلہ نہ ہونے ہی کی بنا پر مولانا کی یہ تمنا بر نہیں آئی کہ "زمانہ اردو کے قدرتی حقوق پر ترجیح کو نظر انداز نہیں کرسکتا" دراصل اس وقت تمام قوم پرستوں کی طرح ان کے سامنے بھی ملک کی آزادی کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انہوں نے اس کے لئے اپنے مذہب، کلچر اور زبان سب کو مستقبل کے لئے اٹھا رکھا تھا اور اس ترنگ میں کانگریس کے بہت سے لیڈروں کی نیتوں کے فتور اور کھوٹ کا پتا ان کی بصیرت نہیں لگا سکی، گاندھی جی نے بہ ظاہر مفاہمت کی ایک راہ نکالی تھی لیکن مدیر الاصلاح نے اسے برزخی زبان قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا ہے، وہ ہندی، ہندوستانی اور اردو سے متعلق گاندھی جی کی بعض تحریروں اور تقریروں کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں گاندھی جی کا مسلک مسلمانوں کی نظر میں بہت مشکوک ہے۔

مدیر الاصلاح فرماتے ہیں کہ ملک کی مشترکہ زبان کا مسئلہ اہم تو ہے اور اسے کسی نہ کسی شکل میں طے بھی کرنا ہے لیکن آزادی کا مسئلہ اس سے زیادہ اہم ہے، اس لئے اس کو آزادی کی راہ میں روک نہیں بننا چاہئے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو اسے فیاضی اور رواداری کے ساتھ طے کر لینے اور مشترکہ زبان کے بلند مقصد کے لئے ہندی اور اردو کے حامیوں کو اپنی جگہ چھوڑنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندی کو اردو سے اور اردو کو ہندی سے قریب ہونا لازمی ہے، ہندی کو سنسکرت کے بجائے اردو کی طرف رخ کرنا ہوگا اور اردو کو عربی وفارسی کے بجائے ہندی سے مانوس ہونا پڑے گا، اس طرح سے ایک قومی زبان جنم لے گی، گاندھی جی کہتے ہیں" جب یہ دونوں زبانیں ہندی اور ہندوستانی یعنی اردو مل جائیں گی اور ان کی آمیزش سے ایک آل انڈیا زبان جنم لے گی اور آئے دن صوبہ جاتی الفاظ سے اس کا خزانہ بھرپور ہوتا رہے گا، اس وقت جا کر

ہمارے پاس اصطلاحات کا ایسا ذخیرہ فراہم ہوگا کہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی"۔

مولانا امین احسن صاحب کے نزدیک بجا طور سے یہ مسئلہ بڑا مشکل ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں:

"ہر جماعت کے سامنے صرف اپنی خواہش ہے، دوسروں کے جذبات اور خواہشیں نہیں ہیں، حالاں کہ مشترکہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خواہشوں کو چھوڑ کر اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھا جائے، مشترکہ زبان کی ضرورت صرف مشترکہ حکومت ہی کو نہیں ہے، اپنے فلسفہ و مذہب کی خدمت کے لئے بھی ہم اس کے محتاج ہیں، کم از کم مسلمانوں کو تو اس چیز کا ضرور استقبال کرنا چاہئے جو ان کے لئے بڑھنے اور پھیلنے کی ایک وسیع شاہ راہ کھول رہی ہو، وہ دنیا میں ایک پیام لے کر آئے ہیں اور اس کا پھیلانا ہی ان کا اصل مقصد ہے"۔(۹۵)

بہار اور اردو: مدیر الاصلاح کے یہ خیالات بڑے خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور وہ واقعتاً بہت مناسب اور معقول تھے لیکن اپنی خواہشیں چھوڑ کر اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنا عملاً دشوار ہی نہیں ناممکن ہے، بعد کے واقعات نے ان کی خوش گمانی پر پانی پھیر دیا، چنانچہ "بہار اور اردو" کے زیر عنوان انہیں اگلے ہی مہینے لکھنا پڑا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ۱۹۳۷ء میں ملک میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو بہار میں اس وقت تک اردو رسم الخط کو بار نہیں حاصل ہوا تھا، نئی وزارت نے یہ عمدہ اور اچھا کام کیا کہ صوبہ کی عدالتوں کے اندر اردو رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دی، یہ اگرچہ اردو کا ایک جائز حق تھا لیکن ہندوؤں کو اس پر شدت کے ساتھ اعتراض ہوا اور بعض ان لیڈروں کو بھی یہ بات کھٹک رہی تھی جن کو اس صحیح اور منصفانہ کارروائی کی نہایت جرأت وہمت کے ساتھ تائید کرنی تھی۔

وہ لکھتے ہیں ہندو لیڈروں کی اسی قسم کی باتیں مسلمانوں کے دلوں میں ان کے آئندہ طرز عمل کے بارے میں طرح طرح کے شبہے پیدا کرتی ہیں اور اس سے آزادی کے بلند مقصد کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، ان کو کانگریس سے یہ حسن ظن تھا کہ وہ اردو زبان اور اردو رسم الخط کی

حفاظت کرے گی، اسی لئے وہ کانگریس کے سچائی سے زیادہ مصلحت کے پرستاروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اب تک یہ اپنے کو اس قابل نہ بنا سکے کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے اعتماد کو جیت سکیں۔(۹۶)

رسم الخط کی حیثیت تو کسی زبان کے لئے جسم کے ناخن جیسی ہے جس کو گوشت سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا جب اس کے معاملے میں مخالف گروہ اپنی خواہشوں کو چھوڑ کر اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنا گوارا نہیں کرسکتا تو وہ دوسروں کے اعتماد کو کیسے جیت سکتا ہے۔

ہندوستانی: ایک جگہ" ہندوستانی" کے عنوان سے تحریر کیا ہے کہ حکومت بہار نے ہندی اردو کی نزاع کے لئے ایک راہ مفاہمت تلاش کرنے کی غرض سے جو کمیٹی مقرر کی تھی، اس کے کاموں کی بابت محکمہ اطلاعات عامہ حکومت بہار کی طرف سے ہم کو ایک طویل مراسلہ موصول ہوا ہے، اس میں کمیٹی کے کاموں کی بابت جو معلومات درج تھیں، ان کے اقتباسات دے کر آخر میں رقم طراز ہیں:

"کمیٹی کی یہ کوششیں قابل تعریف اور ملک کے شکریے کی مستحق ہیں مگر زبان کے معاملہ میں مسلمانوں کی شکایات عموماً کانگریس اور اس کی بنائی ہوئی کمیٹیوں کی تجاویز سے نہیں ہیں، کانگریسی ہندوؤں کے طرز عمل سے ہیں اور اس مشکل کا نہ صرف یہ کہ کوئی علاج نہیں ہوسکا بلکہ جو لوگ علاج کرسکتے ہیں وہی اس مرض کو بڑھانے میں سرگرم ہیں، ضرورت ہے کہ کانگریس اور کانگریسی گورنمنٹیں ایمان داری کے ساتھ اس مرض کا علاج کریں اور اپنی باتوں کو خود اپنے منھ سے نہ جھٹلائیں"۔(۹۷)

قومی کشمکش: ۹-الاصلاح کا زمانہ اشاعت مسلم لیگ اور کانگریس کی شدید کشمکش کا دور تھا، اس کے شذرات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدیر الاصلاح مسلم لیگ سے سخت بیزار اور کانگریس کے حامی تھے لیکن اس سے اس زمانے میں مسلمانوں کو جو اندیشے تھے جس کا موقع خود کانگریس کے لیڈر اور کارکن اکثر فراہم کردیتے تھے اس سے بھی وہ بے خبر نہیں تھے، اس لئے ان پہلوؤں سے انہوں نے کانگریس پر تنقید بھی کی ہے اور کہیں کہیں اس کی طرف سے صفائی

بھی دی ہے، علما کی تنظیم جمعیۃ علما کا تعاون بھی اس کو حاصل تھا اور وہ بھی مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی شدید مخالف تھی، الاصلاح جمعیۃ کے موقف کو صحیح سمجھتا تھا، مدیر الاصلاح لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی رہنما جماعت صرف جمعیۃ علما ہوسکتی ہے، لیگ سرتاسر فتنہ ہے، کانگریس ناگزیر ہے اور جمعیۃ علما کی رہنمائی میں انشاء اللہ تمام خطرات سے مامون-اور الگ الگ گھروندے بنانے والوں سے الاصلاح کو سخت اختلاف ہے، لیڈروں اور جماعتوں کی کثرت ہی ہماری تباہی کا اصلی سبب ہے"۔(۹۸)

لیکن جمعیۃ کو بھی الاصلاح معصوم نہیں سمجھتا تھا، اس نے اس کے نقائص اور خامیاں بھی اجاگر کی ہیں، یہ بحثیں اب فرسودہ ہوچکی ہیں لیکن ان سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں سے اس زمانے میں کیا چوک اور غلطی ہوئی ہے جس کا خمیازہ اب تک وہ بھگت رہے ہیں اور لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی ؏ یک لمحہ غافل بودم صد سالہ راہم دور شد

ممکن ہے اس تذکرہ سے انہیں تنبہ ہو اور آیندہ اصلاح وتلافی کی صورت نکلے۔

قومی کشمکش کی اس داستان کے تین کردار ہیں، الاصلاح میں ان تینوں کا مشترکہ ذکر بھی ملتا ہے اور الگ الگ بھی، پہلے مسلم لیگ کو لیجیے جس کو مولانا امین احسن صاحب سخت ناپسند کرتے تھے۔

مسلم لیگ: وہ مسلم لیگ کے چند مغالطوں کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ آج تنظیم کے ہنگامہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اخبارات ورسائل، منبروں اور اسٹیجوں پر یہی ایک پکار ہے، ان کو بھی تسلیم ہے کہ کسی قوم کی طاقت تنظیم ہی میں مضمر ہے، جو قوم منظم نہ ہو وہ بھیڑ ہے، انبوہ ہے، چوپایوں کا گلہ ہے، بکریوں کا ریوڑ ہے، قوم نہیں ہے مگر ان کے نزدیک تنظیم مقصد نہیں ذریعہ ہے، دیکھنے کی چیز اس کا مقصد اور یہ ہے کہ وہ کن اصولوں اور مبادی پر ہے، بازار کے چبوترے پر ایک اشتہاری دوا فروش اپنی عجیب عجیب صداؤں سے اپنے اردگرد ہزاروں کی بھیڑ اکٹھی کرلیتا ہے مگر یہ بھیڑ ایک طرف سے جمع ہوتی اور دوسری طرف سے چھٹتی بھی رہتی ہے اور سورج کے غروب ہوتے ہوئے وہ اپنی پھیلی ہوئی تھیلیاں جمع کرتا ہے اور ایک متنفس بھی موجود نہیں رہتا،